سرسید اور اصلاحِ معاشرہ

شاہد حسین رزاقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

سرسیّد اور اصلاحِ معاشرہ

شاہد حسین رزاقی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

محمد اقبال صاحب ذخیرہ لاہور

۱۹۶۳ء
ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

136135

طبع اوّل :- ۱۹۶۳ء

تعداد :- ۱۱۰۰

مطبوعہ دین محمدی پریس بُل روڈ لاہور
ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

انتساب

جناب محمد سعید الزماں صاحب ایم۔ اے (علیگ)

کے نام

جن کے فیضِ تربیت سے میں علی گڑھ تحریک کا گرویدہ بن گیا۔

شاہد

فہرست

پہلا باب
سرسیّد کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت

مسلمانوں کا زوال ۱۰
معاشری خرابیاں ۱۱
سرسیّد کے تاثرات ۱۳
معاشرہ کی عام کیفیّت ۱۴
شرفا اور معزز خاندانوں کا حالِ زار ۱۶
عوام کی اقتصادی بدحالی ۱۷
دولت مندوں کی خودنمائی ۱۹
جدید اور مفید تعلیم سے محرومی ۲۰
ہمدردوں کا غلط رویّہ ۲۱
سرسیّد کا انتباہ ۲۲

دوسرا باب
معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ ۲۵

بُنیادی مسائل ۲۷
تہذیب اور ترقی کے محرکات ۲۸
مہذّب اور غیر مہذّب میں فرق ۳۰
مہذّب قوم کی پیروی کے اصول ۳۱
معاشری اصلاح کا خاکہ ۳۲
۲۹ نکات ۳۳
تہذیب الاخلاق ۴۰
مقاصد اجراء ۴۱
رسالہ کی اشاعت ۴۳
ردِّ عمل ۴۴
اصلاحی کوششیں ۴۴
خدمات اور اُن کی نوعیّت ۴۵

تیسرا باب
تعلیم کی اصلاح اور ترقی ۵۰

تعلیم کا مقصد ۵۱
تربیّت کی اہمیّت ۵۲
تعلیم اور تربیّت کا فرق ۵۳
تربیّت کا زمانہ ۵۴
تربیت کا صحیح طریقہ ۵۵
تعلیم اور عملی زندگی ۵۷
مذہبی تعلیم کی ضرورت ۵۸
پُرانے علوم کی حالت ۶۰
انگریزی کی تعلیم ۶۲
دیسی زبان میں تعلیم کی اہمیّت ۶۴
مسلمانوں کے لئے تعلیم کیسی ہو؟ ۶۶

جدید علوم کی ضرورت ۶۸
تعلیمی اصلاح و ترقی کیلئے عملی کوششیں ۶۹
مدارس کا قیام ۷۰
سائنٹفک سوسائٹی ۷۱
اردو یونیورسٹی کی تحریک ۷۲
برطانوی طرزِ تعلیم کا مطالعہ ۷۴
کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم مسلمانان ۷۵
سرکاری اسکولوں سے تنفر کے اسباب ۷۶
کالج قائم کرنے کا فیصلہ ۷۷
ابتدائی مدرسہ کا قیام ۷۸
کالج کا قیام ۷۸
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ۸۰

چوتھا باب

دینی عقائد کی درستی ۸۳
مذہب کی سچائی اور فضیلت کا معیار ۸۵
دین و دنیا میں تفریق کا رجحان ۸۶
عبادت کا مفہوم ۸۸
زہد و ریاضت ۸۹
ترکِ دنیا ۹۰
پاک اور ناپاک علوم ۹۳
ثواب اور اس کا مقصد ۹۵
ثواب کے کام ۹۶
تقلید پرستی ۹۸
پیری مریدی ۱۰۱

پانچواں باب

اخلاق و عادات کی اصلاح ۱۰۹
نقصان رساں عادتیں ۱۰۹
ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی ۱۱۰
اجداد پر بے جا فخر ۱۱۳
عزت کا غلط تصور ۱۱۴
ظاہرداری ۱۱۶
کردار کو بگاڑنے والی خرابیاں ۱۱۸
تعصب ۱۱۹
بے جا مخالفت ۱۲۲
خوشامد پسندی ۱۲۴
بحث و تکرار کی عادت ۱۲۵
کردار کو بنانے والی خوبیاں ۱۲۷
آزادیٔ رائے ۱۲۷
قلبی اور عقلی قوت سے کام لینا ۱۲۹
اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا ۱۳۰
رجائیت پسندی ۱۳۲
اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ ۱۳۴

چھٹا باب

رسوم و رواج میں مفید ترمیم ۱۳۹
رسم و رواج اور ان کی نوعیت ۱۴۰
رسوم و عادات کا مبدا و منشا ۱۴۱

رسمیں اختیار کرنے کا اصول ۱۴۲
رسم و رواج کا اثر ۱۴۴
تبدیلی کی ضرورت ۱۴۵
مذہبی رسموں میں تضاد ۱۴۵
معاشری رسموں میں اختلاف ۱۴۶
رسمیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں ۱۴۸
رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات ۱۴۹
تقلید کی عادت پڑ جاتی ہے ۱۴۹
ذاتی قوتیں پژمردہ ہو جاتی ہیں ۱۵۱
قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے ۱۵۲
ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے ۱۵۲
مفید رسمیں بھی مضر بن جاتی ہیں ۱۵۴
چینی قوم کی مثال ۱۵۵
مسلمان اچھی رسمیں اختیار اور
بُری رسمیں ترک کریں ۱۵۶
بااثر اور ذی مرتبہ لوگوں کا فرض ۱۵۸
مہیب رسموں کے اسباب ۱۵۹
اصلاحِ رسوم کا مؤثر ذریعہ ۱۶۰
عوام میں پروپگنڈہ کی مہم ۱۶۱
رسموں میں اصلاح کی عملی مثال ۱۶۲
ساتواں باب ۱۶۵
تمدّن اور طرزِ معاشرت میں تبدیلی
غلامی کا انسداد ۱۶۶
حکماء اور انبیاء کی روش ۱۶۷
عالمگیر بُرائی ۱۶۸
اسلام پر غلط الزام ۱۷۰
اسلام کی انسدادی تدابیر ۱۷۰
ہندوستان میں بردہ فروشی ۱۷۲
تعدد ازواج ۱۷۲
ناگزیر معاشری خرابی ۱۷۳
اسلام کی عائد کردہ پابندی ۱۷۴
مسلمانوں میں بُرا رواج ۱۷۵
یتیم اور لاوارث بچّوں کا مسئلہ ۱۷۶
سرسید کی تجاویز ۱۷۷
وراثت کا مسئلہ ۱۷۸
وراثت اور وصیّت ۱۷۹
جائداد وقف کرنے کے فوائد ۱۷۹
سرسید کی تجویز ۱۸۰
بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کا مسئلہ ۱۸۱
عام رواج کے نقصانات ۱۸۱
اصلاح کی ضرورت ۱۸۳
طریقۂ زندگی ۱۸۳
طرزِ معاشرت کا اثر ۱۸۴
کھانا کھانے کے طریقے ۱۸۵
ناشائستہ عادتیں ۱۸۶
انگریزی طریقہ ۱۸۶

قومی لباس کی ضرورت ۱۸۸
کوئی لباس اسلام کا جز نہیں ۱۸۸
مشابہت کا غلط نظریہ ۱۹۰
داڑھی منڈانا درست ہے ۱۹۰
اسلامی ممالک پر نئی تہذیب کا اثر ۱۹۲
ترکوں کی قابلِ تقلید مثال ۱۹۴

آٹھواں باب

ملّی اتحاد اور مذہبی رواداری ۱۹۶
مسلمانوں میں اتحاد ۱۹۷
روحانی رشتہ ۱۹۷
فرقہ بندی کے نتائج ۱۹۸
اتحاد و اتفاق بڑھانے کے اصول ۱۹۹
غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات ۲۰۰
حُبِ ایمانی اور حُبِ انسانی ۲۰۱
مذاہب کے پیشواؤں کا احترام ۲۰۲
ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت ۲۰۳
ہندوستان کی دو آنکھیں ۲۰۴
علی گڑھ کالج ہندوؤں کے لئے بھی ہے۔ ۲۰۶
اُردو قومی اتحاد کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ ۲۰۷
فرقہ پرستوں کا مایوس کُن طرزِ عمل ۲۰۸
مُسلم مسیحی اتحاد ۲۰۹
انگریزوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ ۲۱۰
انجیل کی تغیر ۲۱۱
غدر کے اسباب ۲۱۱
مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول ۲۱۳
خوشگوار تعلقات ۲۱۴
حضرت عیسٰی کا احترام ۲۱۶
انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا ۲۱۷
طعامِ اہلِ کتاب جائز ہے ۲۱۸
انگریز اہلِ کتاب ہیں ۲۱۸
چھری کانٹے سے کھانا بھی سنت ہے ۲۱۹

نواں باب

عورتوں کے حقوق کا تحفّظ ۲۲۲
اسلام کے عطا کردہ حقوق ۲۲۳
انگریز عورت کی قانونی حیثیت ۲۲۳
مسلمان عورت کا مساوی مرتبہ ۲۲۵
مسلمانوں کا طرزِ عمل ۲۲۵
عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ۲۲۷
تعلیمِ نسواں کی حمایت ۲۲۸
سرسید کا نقطۂ نظر ۲۳۰
عورتوں کی تعلیم کی نوعیت ۲۳۲
زنانہ مدارس کا سوال ۲۳۴
حالات کا تقاضہ ۲۳۶
اصلاح کا طریقہ ۲۳۷
تتمہ [illegible]

پہلا باب

سرسیّد کے زمانے میں مُسلمانوں کی حالت

ہندوستان پر مسلمانوں نے سات سو برس تک حکومت کی اور ان کے کارناموں نے دنیا کی تاریخ میں اس ملک کو بھی باعظمت اور باوقار بنا دیا۔ مسلمان ہندوستان میں اجنبی نہیں بنے رہے بلکہ یہاں کی ایک قوم بن گئے۔ اور نہ صرف سیاسی و معاشی برتری بلکہ اعلیٰ تہذیب و تمدن، ذاتی اوصاف اور قومی خصوصیات کے اعتبار سے بھی وہ ہندوستانی معاشرہ میں سب سے زیادہ معزز و ممتاز رہے۔ اور ان کی یہ فضیلت و برتری صدیوں تک قایم رہی مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان کی حالت نہ صرف سیاسی اعتبار سے انتہائی خراب تھی بلکہ تہذیب و تمدّن اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے بھی یہ ملک نہایت پستی کی حالت میں تھا اور ہندوستانی معاشرہ بحیثیت مجموعی ایک نیم وحشی معاشرہ تھا جس میں ذات پات، چھوت چھات، دُختر کُشی اور حیوان پرستی جیسے غیر مہذب طریقے نہ صرف رائج تھے بلکہ یہ معاشرہ کی اساس بھی تھے اور ان کو تقدس و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلمان ہندوستانی معاشرہ کی ان خرابیوں کو پوری طرح ختم نہ کر سکے کیونکہ ان کو مذہبی تائید حاصل تھی۔ چنانچہ انگریزی دَورِ حکومت میں بھی ان بُری رسموں میں سے صرف ستی اور دُختر کشی کو بہ مشکل ختم کیا جا سکا اور دوسری بے شمار رسمیں اب تک جاری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں بھی عام معاشرہ میں تو کوئی فوری اور بڑا انقلاب نہ ہو سکا لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقوں نے جن میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت شامل تھی حیرت انگیز

ترقی کی۔ اور مسلمان فرمانرواؤں اور ان کے امرا کے تمدنی کارنامے تو اس قدر عظیم الشان تھے کہ ان کی بدولت ہندوستان بھی اس زمانے کے مہذب ترین ممالک میں شمار ہونے لگا۔ جب تک مسلمان حکمران اور ترقی پذیر قوم رہے ان کی یہ امتیازی حیثیت بھی قائم رہی۔ لیکن جب ان کو زوال ہونے لگا تو ان میں طرح طرح کی خرابیاں بھی پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ حکومت سے محرومی اور انگریزوں کی محکومی نے ان کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور ان کا مستقبل نہایت تاریک نظر آنے لگا۔

مسلمانوں کا زوال

مسلمانوں کی زندگی میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے وہ ان کے زوال کا سبب بنے اور ان میں سب سے زیادہ نقصان رساں وہ معاشری خرابیاں تھیں جن کی جڑیں رفتہ رفتہ بہت گہری اور مضبوط ہو گئی تھیں۔ مسلمانوں میں یہ خرابیاں ان کے سیاسی زوال سے پہلے ہی پیدا ہونے لگی تھیں۔ اور آخر کار یہ اتنی عام ہو گئیں کہ پورا معاشرہ ان سے متاثر ہو گیا اور یہ خرابیاں بھی مسلم قوم کے زوال کا بنیادی سبب بن گئیں۔ ہندوؤں کے معاشری اثرات، ان کے عقائد و نظریات، رسوم و رواج اور توہمات اور طرزِ معاشرت نے مسلمانوں پر رفتہ رفتہ اتنا اثر ڈالا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا معاشرہ اسلامی خصوصیات سے بڑی حد تک محروم ہو گیا اور زندگی کے اہم شعبوں پر غیر اسلامی اثرات غالب آ گئے۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں ہندو قوم میں کئی نامور مصلح پیدا ہوئے جن کی کوششوں سے ہندوؤں نے اپنی معاشری حالت درست کرنے پر توجہ کی اور حالات سے پورا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کے برعکس مسلمان زمانے کے تقاضوں سے بالکل غافل رہے اور اپنی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہ کی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بدلے ہوئے حالات نے مسلمانوں کی معاشری حالت کو بد سے بدتر بنا دیا اور ان کے معاشری عیوب پہلے سے بہت زیادہ نقصان رساں ہو گئے۔

سیاسی زوال کی وجہ سے مسلمانوں کا معاشری وقار بہت گر گیا تھا۔ حکومت، عہدے اور جاگیر و منصب ان کی معاشری برتری اور معاشی خوش حالی کا ذریعہ

تھے۔ اور جب مسلمان ان ذرائع سے محروم ہو گئے تو ان کی اقتصادی حالت بھی خراب ہو گئی۔ حکومت و سلطنت چھن جانے سے وہ اپنے معاشری مرتبے سے اس طرح گرے کہ اپنی محکوم قوموں کی سطح پر آ گئے۔ اور ایک ایسی یورپی قوم کے محکوم بنے جو اُن کو شک و شبہ اور خطرہ کی نظر سے دیکھتی تھی اور اسی بنا پر مسلمانوں کے مقابلے میں ان قوموں کو ترجیح دیتی تھی جو صدیوں مسلمانوں کی محکوم رہ چکی تھیں۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی طرف سے ان کے تمام اندیشے بالکل درست تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے آیندہ خطرات کا انسداد کرنے کے خیال سے مسلمانوں کو ہر طرح سے تباہ و برباد کر دیا۔ ہزاروں لوگ جو مختلف حیثیتوں سے سربرآوردہ تھے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ باعزّت لوگ بے عزّت کیے گئے۔ دولت مند اور خوش حال گھرانے مفلس و محتاج بنا دیے گئے۔ اور جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پوری مسلم قوم کو ظلم و ستم کا شکار بنا کر ایسے مصائب و آلام میں مبتلا کر دیا گیا جن سے نجات پانے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس طرح وہ قوم جو ہندوستانی معاشرہ میں صدیوں تک معزز و ممتاز اور باوقار رہی ذلیل و خوار ہو گئی اور اس کی مکمل تباہی یقینی معلوم ہونے لگی۔ اس تباہی سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت تھی وہ ان میں باقی نہ رہے تھے اور ان کو پھر پیدا کرنا نہایت اہم اور ضروری لیکن انتہائی مشکل کام تھا۔

معاشری خرابیاں ہندوستانی مسلمانوں کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے ان کے پورے معاشرہ کی اصلاح کرنا لازمی تھا جس کو غیر اسلامی اثرات، رسوم و رواج اور توہمات نے بالکل بگاڑ دیا تھا۔ اور خود مسلمانوں کے غلط رجحانات نے بھی اس کی صورت مسخ کر دی تھی۔ ذات پات کی تفریق، فرقہ داری اختلاف اور تعصب و تنگ نظری نے ملّی اتحاد اور معاشری ہم آہنگی کو ختم کر دیا تھا۔

اور مختلف فرقے ایک دوسرے کو اسلام سے خارج قرار دیتے تھے۔ عورتوں کی محکومی، حق تلفی اور جہالت اور کثرتِ ازواج جیسی بُری رسموں نے پورے معاشرہ پر تباہ کُن اثر ڈالا تھا۔ اور غلامی کے انسداد کی تحریک عام ہو جانے کے باوجود لونڈی غلام رکھنے کا طریقہ ملک کے بہت سے حصّوں میں باقی تھا۔ شادی غمی ہر موقع پر بُری رسموں اور رواج کی پابندی شدّت سے کی جاتی تھی جن سے معاشری اور معاشی ہر لحاظ سے نقصان ہوتا تھا۔ چھوت چھات کا اثر اس قدر پڑا تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا پینا بھی مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی مسلمانوں کو اپنے مذہب سے بڑی محبت رہی لیکن عقائد کی خرابی نے مذہب کی شکل بھی بگاڑ دی۔ چنانچہ اسلام کے بُنیادی اُصول و مقاصد تو نظر انداز کر دیے گئے۔ اور فروعات کو اصل دین سمجھ کر گمراہ کُن عقائد کی پیروی کی جانے لگی۔ اسلام اور بانیِ اسلام سے غلط باتیں منسوب کر کے ان کی اتباع کو دین داری قرار دیا جاتا تھا اور اصل دین کی پیروی کرنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ دین کو دُنیا سے بالکل الگ کر کے محض اوراد و وظائف کو عبادت تصوّر کیا جاتا تھا اور یہ حقیقت بالکل فراموش کر دی گئی تھی کہ اسلام ایک مکمّل دین اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ تقلید پرستی نے غور و فکر اور اجتہاد کرنے کی راہیں بند کر دی تھیں اور پیری مریدی کی بگڑی ہوئی شکل نے ایک ایسا گمراہ کُن مذہبی طبقہ بنا دیا تھا جو دین اور دنیا دونو کو برباد کر رہا تھا۔ اخلاق و عادات کے اعتبار سے بھی پوری قوم کی حالت بہت خراب تھی۔ تعصب و تنگ نظری، باہمی مخالفت و عداوت، خوشامد پسندی، جھوٹی شان و شوکت کا اظہار، ماضی اور اسلاف پر بے جا ناز، قدامت پرستی میں شدّت، اصلاح و ترقی سے نفرت، جد و جہد سے گریز اور مایوسی و الم پسندی جیسی تباہ کُن خرابیاں خصلت و عادت بن گئی تھیں۔ معاشرہ کی ان تمام خرابیوں کی اصلاح کرنے کی مؤثر ترین تدبیر یہ ہو سکتی تھی کہ تعلیم کی اشاعت کر کے لوگوں میں اپنی حالت کا شعور اور ترقی کا احساس پیدا کیا جائے۔ لیکن اس راستے میں بھی بڑی دشواریاں حائل

تھیں۔ عوام بالکل جاہل تھے۔ اور جن لوگوں نے تعلیم پائی تھی وہ صحیح تعلیم اور اچھی تربیت سے بالکل محروم رہے تھے۔ تعلیم کا طریقہ نہایت ناقص تھا اور جن علوم کی تعلیم دی جاتی تھی اور جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ اس زمانے کے لیے بالکل بے فایدہ اور بیکار تھیں۔ آباواجداد کے پُرانے علوم پر بڑا ناز تھا اور اس بات کا پتہ تک نہ تھا کہ اس کے بعد سیکڑوں سال کے دوران میں ان علوم نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ جدید علوم کی نوعیت کیا ہے اور اس کے کیا فوائد ہیں اس سے تو مطلق واقفیت نہ تھی لیکن تعصّب کا یہ عالم تھا کہ لوگ ان سے نفرت کرتے اور ان کو ناپاک سمجھتے تھے۔ حالات کی تبدیلی سے جدید علوم اور انگریزی کی تعلیم معاشری ترقی اور معاشی خوش حالی کا ذریعہ بن گئی تھی لیکن مسلمان انگریزی پڑھنا خلافِ مذہب سمجھتے تھے اور اس کے خلاف ان کا تعصب اس حد تک بڑھا ہُوا تھا کہ جب حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی تو ہندوؤں نے اس سے پورا فائدہ اُٹھایا لیکن مسلمانوں نے آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں اور عالموں کے دستخط سے حکومت کو ایک محضر نامہ پیش کیا جس میں انگریزی کی تعلیم سے اختلاف کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت اس طریقے سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ایسے ناموافق اور دشوار حالات میں معاشرہ کی اصلاح کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اور اس کے لیے ایسے مصلحین کی ضرورت تھی جو غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ جن کے دل میں قوم کا سچا درد اور خلوص ہو۔ جو قوم کے امراض کی صحیح تشخیص کرکے ان کو دور کرنے کی مؤثر تدبیریں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو ہر قسم کی مخالفت اور رکاوٹ کے باوجود معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لئے پورے عزم و استقلال سے اپنی جدوجہد کو کامیاب بنا سکیں۔

سرسیّد کے تاثرات

قومی زوال و ادبار کے اس نازک دَور میں ہندوستانی مسلمانوں کو خوش قسمتی

سے سرسیّد احمد خاں جیسا عظیم مصلح اور رہنما مل گیا جن کی کوششوں نے تباہی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلمانوں کو بچالیا۔ سرسیّد کی اصلاحی سرگرمیوں نے ایک منظم تحریک کی شکل اختیار کرلی، جو انتہائی ناموافق حالات کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان معاشری اصلاح اور قومی ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئے۔

سرسیّد نے جس قوم کی ہر جہتی معاشری اصلاح اور ترقی کا مشکل کام اپنے ذمے لیا اور اس کو زوال و پستی کی حالت سے نکال کر ترقی دینے کی کوشش کی وہ کس حال میں تھی اور اس کے لئے کن کن اصلاحات کی ضرورت تھی اس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اپنی متعدد تحریروں اور تقریروں میں اُنھوں نے اس دَور کے مسلمانوں کی جو کیفیّت بیان کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پوری قوم کی زندگی کے ہر شعبہ میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور دینی، اخلاقی، معاشری، اقتصادی، تعلیمی ہر اعتبار سے تمام طبقوں کا جو بُرا حال تھا ان سب کا سرسیّد نے بہت غور سے مطالعہ کیا تھا اور ان کو اپنی اصلاحی تحریک میں پوری طرح ملحوظ رکھا تھا۔

معاشرہ کی عام کیفیّت

سرسیّد کے زمانے میں مسلم معاشرہ کی جو عام حالت تھی مختلف طبقوں کی جو کیفیت تھی۔ معاشری، دینی، اخلاقی اور اقتصادی اعتبار سے ان میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کا سرسیّد نے اپنی تحریروں میں بار بار اظہار کیا ہے اور اُنھوں نے جو حالات اور تاثرات قلم بند کئے ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کی عام کیفیّت کیا تھی۔ سرسید نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اس ملک میں ہماری قوم کا حال نہایت بدتر ہے۔ اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہلِ مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبّر و غرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ علم

ادب وانشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن کلموں کے تک ملانے اور دُور از کار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فنِ شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہو گی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ بھی نیک جذباتِ انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تہذیب واخلاق کے خلاف ہیں۔ علم دین تو وہ خراب ہُوا ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اس معصوم، سیدھے سادے، سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبرؐ نے جو خدا کے احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل، اَن پڑھ، بادیہ نشین عرب کی قوم کو پہنچائے تھے اس میں وہ نکتہ چینیاں اور باریکیاں گھسیڑی گئیں اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائل منطقیہ ملائی گئیں کہ اس میں اس سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ بہ مجبوری لوگوں کو اصلی احکام کو جو قرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔ علمِ مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقے پر پڑ گیا ہے جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف مُنہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپر تپاک جتانے کا نام ہے۔ اب مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے اور بے ایمانی اور دغابازی کا نام ہوشیاری۔ گفتگو پر خیال کرو تو عجیب حالت دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں اکھڑ مضمون زبان سے نکلتے ہیں۔ نہایت مہذّب اور معقول وثقہ اور نیک و دیندار آدمی بھی اپنی گفتگو میں تہذیب وشائستگی کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اگر اشراف جوان دوستوں کی محفل میں جاؤ تو سنو کہ وہ آپس میں کیسی گالم گلوچ اور فحش باتیں ایک دوسرے کی نسبت کرتے ہیں۔ امیروں کا حال دیکھو تو ان کو دن رات بٹیر لڑانے اور مُرغ لڑانے اور کبوتر اُڑانے اور اسی طرح تمام لغویات میں اپنی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کچھ کام دھندا نہیں۔ اور مذہبی طبقہ کا یہ حال کہ کینہ ونخوت اور اپنے تقدس وبزرگی اور خدا پرست ہونے کا گھمنڈ مقدس لوگوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا پاؤ گے۔ اور اگر دنیا میں شیطان کو ڈھونڈتے پھرو تو

بجز مقدسین کے جبّہ و دستار مبارک کے اور کہیں پتہ نہیں ملے گا۔

شرفا اور معزز خاندانوں کا حالِ زار

شرفا کا طبقہ اور معزز خاندان ہر معاشرہ کی روح ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے نہ صرف تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کو فروغ ہوتا ہے بلکہ گرتے ہوئے معاشرہ کو سنبھالنے کی توقعات بھی بہت کچھ انہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن اس زمانے میں ان کی بھی بُری حالت تھی جس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے سرسیدؒ نے لکھا ہے کہ "ہمارے ملک کے شرفا کی حالت موجبِ ذلّت و رُسوائی ہے۔ جب ہم ان نامی گرامی خاندانوں پر نظر ڈالتے ہیں جو ایک زمانے میں معدنِ علم و ہنر اور مخزنِ فضل و کمال تھے تو اب وہی خاندان سب سے زیادہ ننگ و عار معلوم ہوتے ہیں اور جن لوگوں کے آبا و اجداد نے صرف علم و عقل کے سبب سے کبھی شرف حاصل کیا تھا وہی لوگ اب علم و عقل سے بے بہرہ ہیں۔ بہت زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ جس قدر ان کے فضل و کمال اور خاندانی اعزاز کی کمی ہوتی جاتی ہے اسی قدر ان کے دماغ نخوت و تکبّر کے بدبودار دھوئیں سے سیاہ ہوتے جاتے ہیں۔

مسلمانوں میں کوئی خاندان نواب زادوں کا ہے، کوئی خاندان امیرزادوں کا ہے، کوئی خاندان مفتی صاحبوں کا ہے، کوئی قاضی صاحبوں کا ہے اور اب انھیں خاندانوں میں جس قدر ذلّت سمائی ہوئی ہے ایسی کسی خاندان میں نہیں ہے۔ اور باوجود ذلّت کے ایک خاندانی نخوت ایسی چیز ہے کہ اس نے بالکل ایسی قوموں کو ذلیل و خوار کر دیا ہے۔ نواب زادے اگرچہ بھیک مانگتے ہوں لیکن اب بھی اپنے نام کے ساتھ نواب ضرور لگالیں گے۔ مفتی صاحبوں کا غلام بھی مفتی کہلاتا ہے اور قاضیوں کے گھر کے چوہے بھی قاضی ہی ہوتے ہیں۔ گو اب مفتی اور قاضی ہونا تو دوسری بات ہے حرف شناس بھی نہ ہوں۔ مولوی اور طبیب اور پیرزادے جو مرجع کل ہوتے ہیں وہ آج اپنے کو عرشِ بریں پر خیال کرتے ہیں اور چونکہ ہمیشہ سے لوگ ان کے سامنے سر جھکاتے چلے آتے ہیں اس سبب سے وہ اپنے تئیں مادر زاد ولی اور

صاحب کمال خیال کرتے ہیں۔"

مسلمانوں کے معزز اور نامور خاندانوں کا حال بیان کرتے ہوئے سرسیّد نے لکھا ہے کہ "ان کی حالت نہایت خراب اور رونے کے لائق ہے۔ ہم نے ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے جن کو دیکھ کر ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آیا ہے جن میں سے ایک شخص تھے کہ ہم نے ان سے ملاقات کی تو فرمایا کہ ہم مولوی حمد اللہ کے پوتے ہیں اور ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اپنے دادا حمد اللہ کا نام صحیح نہیں لے سکتے تھے۔ ہم نے ایک نواب زادے کو جو ابھی غدر میں تباہ ہوا ہے دیکھا تو ہم کو شبہ ہوا کہ شاید یہ کوئی تمباکو فروش ہے۔ ہم نے انشاء اللہ خاں کے پوتے کو بھی دیکھا ہے اور ہم کو ان کی حالت اور صورت سے ہرگز اس بات کا یقین نہ ہوتا تھا کہ ایسے نامور کی نسل میں بھی ایسا شخص ہو سکتا ہے۔ ہم نے بادشاہ زادے بھی دیکھے ہیں جو گولا کبوتر کو سیٹی پر لگانے اور طوطوں کو پنجروں پہ اُڑانے اور بٹیروں کو لڑانے کے سوائے اور کوئی نشانِ شاہزادگی نہ رکھتے تھے۔ اور جب ہم نظر کرتے تھے تو ہم کو خود اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ بلاشبہ یہ قوم ضرور تباہ ہونے کے لائق تھی اور خدا کا بڑا رحم تھا جو ایسے لوگ ہماری گردنوں کے مالک اور ہم پر حکمران نہ رہے۔"

عوام کی اقتصادی بدحالی

اس زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی کس قدر خراب ہو گئی تھی اس کا اندازہ عید جیسے خوشی کے تہوار کی اس کیفیّت سے ہو سکتا ہے جس کا نقشہ سرسیّد نے اس طرح کھینچا ہے۔ "عیدگاہ میں بڑا اژدہام خلائق کا تھا تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ دھوپ میں ذرا تیزی آگئی تھی۔ عیدگاہ میں پورا فرش تو ہے نہیں اور لوگوں کو اتنا مقدور نہیں کہ مصلّے خریدیں۔ ہزاروں آدمی دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے ..... وہاں ہزاروں مسلمان تھے مگر ایک سے ایک بدتر حالت میں۔ مسلمانوں میں عید کا دن بڑی خوشی کا دن ہے۔ ہر ایک مسلمان اپنے مقدور بھر اچھے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔ پنساری بھی دو دو کوڑی جمع کر کے عید کے لئے اپنے بچے کو نیا جوڑا بنا دیتی ہے۔ عیدگاہ میں میں نے ہزاروں پر

نظر ڈالی۔ کسی کے گلے میں بجز گزی اور ادھوتر کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ کپڑے تو سب کے دھوئے ہوئے اور اُجلے تھے مگر ہزاروں آدمیوں کے انگرکھوں میں پیوند لگے تھے۔ اگر کسی کے گلے میں گزی کا نیا انگا تھا تو یقین جانئے پُرانا پاجامہ تھا جس میں چھلنی کے سے چھید تھے۔ جوتے تو کسی کے پاؤں میں ثابت نہ تھے۔ بہتوں نے رسی یا چیتھڑے سے باندھ لئے تھے۔ کیونکہ پاؤں سے نکل نکل جاتے تھے۔ بڑے بوڑھوں کا کچھ ذکر نہیں بچّوں کو عید کے دن اچھے اچھے کپڑے پہننے کا اور کھلونوں کے لینے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ لیکن کسی بچے کا یکساں لباس نہ تھا۔ اگر سر پر جھولے گوٹے کی ٹوپی تھی، تو پاؤں میں جوتا نہیں۔ پاجامہ نیا ہے تو انگا پُرانا ہے۔ ہر ایک آدمی پر ایسے مبارک اور خوشی کے دن میں بھی نہایت افلاس اور مصیبت برستی تھی کسی کا دل اندر سے خوش نہ تھا۔ ہر ایک غمگین، روتی صورت، بسورتی شکل، تیوری چڑھی ہوئی۔ داڑھی پر گرد پڑی ہوئی۔ پیادہ پا چلنے سے پسینے میں شور بور۔ سب نہایت پریشان اور متفکر نظر آتے تھے۔ عیدگاہ کے باہر ایک غول بھیک منگوں کا تھا جو دو دو کوڑی مانگتے تھے۔ اور پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ بیسیوں مسلمان سڑک پر کپڑا بچھائے بیٹھے تھے اور پکار رہے تھے "کچھ خیرات دیتے جاؤ۔ تیسوں روزے قبول"۔ ایک طرف سینکڑوں عورتوں کا غول تھا اور ان میں بیسیوں برقع اوڑھے چلّا رہی تھیں کہ "اے بیٹا ہم سیدانی ہیں۔ فاطمہ بی بی کا دانہ کھانے والی ہیں۔ اشراف گھرانے کی ہیں۔ ہم پر مصیبت پڑی ہے۔ اپنے بال بچوں کا صدقہ۔ خاتون جنت کا صدقہ۔ کچھ دیتے جاؤ"۔

مفلس و محتاج مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کی کیا حالت تھی اس کا اندازہ ان لوگوں کی خوش حالی سے کیا جا سکتا ہے جو عید کا تماشا دیکھنے آئے تھے اور جن کی کیفیت سرسیّد نے یوں بیان کی ہے "دو چار نوجوان ہندو بھی نہایت عمدہ گھوڑوں پر سنہری روپہلی ساز لگائے ہوئے کارچوبی غاشیہ گھوڑوں پر ڈالے ہوئے نہایت عمدہ نفیس کپڑے پہنے، زمرد و یاقوت اور موتیوں کی مالائیں اور کنٹھے گلے میں

ڈالے ہوئے، نہایت نفیس سرخ رنگ اور طلائی تلہ کا چیرہ باندھے ہوئے سیر کرتے پھرتے تھے۔ دو چار نوجوان بنگالی بھی نظر آتے تھے۔ سیاہ نفیس دو اشرفی کا ولایت کا بنا ہوا بوٹ، سفید پتلون اور کالا کوٹ اور دفلیا ٹوپی پہنے۔ ہاتھ میں خوبصورت پتلی سی چھوندنا پڑی چھڑی لئے۔ انگریزی میں غٹ پٹ کرتے۔ لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے پھرتے تھے۔۔۔ گھوڑوں کے آگے تین چار مسلمان بھی دکھائی دیئے جو کچھ آسودہ حال معلوم ہوتے تھے۔ جب پوچھا کہ یہ کون ہیں تو معلوم ہوا کہ لالہ چھنا مل کے بیٹے بھی سیر کو آئے ہیں اور یہ ان کے سائیس ہیں۔ انھوں نے عید سے پہلے کہا تھا کہ مہاراج ہمارا تہوار ہے اگر تنخواہ مل جاوے تو بڑی پرورش ہوگی۔ مہاراج نے روکڑیئے کو کہا تھا کہ یہ مسلا تہوار، تہوار پکار رہا ہے، آنہ روپیہ بیاج کا کاٹ کر اس مسلے کو پیشگی تنخواہ دے دو۔ سرسید کے ذہن نے عید کی جو یہ فلمی تصویر کھینچی ہے وہ ایسی دو قوموں کا صحیح عکس ہے۔ جن میں سے ایک جو اس ملک پر صدیوں حکومت کر چکی تھی اپنی معاشری حالت کو بگاڑ کر نکبت و افلاس کا شکار بن گئی تھی۔ اور دوسری جو صدیوں سے معاشری پستی اور سیاسی محکومی میں زندگی گذار رہی تھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ کی اصلاح کر کے خوش حال ہو گئی تھی۔

دولتمندوں کی خودنمائی

عام مسلمانوں کا تو یہ حال تھا اور جو لوگ خوشحال تھے وہ نمود و نمائش کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور مذہب اور قوم کی خدمت سمجھ کر جو روپیہ صرف کرتے تھے وہ بھی دراصل ضائع ہو جاتا تھا۔ بمبئی کے میمن جو تجارت کرتے تھے اور بہت خوش حال تھے ان کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ اور ان کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میمنوں نے بجز اس کے کہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں۔ اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور اپنی شیخی کے پیچھے مرتے ہیں اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔ ان کو مسجد بنانے کا بڑا شوق ہے۔ بہت سے میمن ہیں جن کے ہاں تھوڑا تھوڑا لنگر خانہ جاری ہے۔

اور ان کی نام آوری کے لئے برائے نام ایک مدرسہ بھی ہے۔ ایک مُلّا اس میں پڑھانے کو نوکر ہے۔ پیر نابالغ برائے نام طالب علم ہیں۔ لنگر خانے سے روٹی پاتے ہیں۔ دن کو ایک آدھ برائے نام سبق پڑھ لیا اور پھر کسی میمن کے لڑکے کو پڑھانے چلے گئے۔ اور کوئی شخص کسی اور طرح سے خیرات مانگنے کا پیشہ کرنے چلا گیا۔ مجھ کو یہ حال دریافت ہونے سے نہایت افسوس ہوا اور میں نے کہا دیکھو قوم کا جو ادیار ہے تو باوجودیکہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بُری طرح خرچ ہوتا ہے۔ جس سے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا۔ البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلاں میمن کا مدرسہ ہے۔ علاوہ اس کے دو کٹ ملّا خوشامدیوں نے تعریف کر دی اور کہا کہ آپ نے تو جنت میں ایک موتی کا محل بنا لیا۔ لعنت اللہ علی الکاذبین۔ وہ لوگ مر گئے جو موتی کا گھر بناتے تھے ایسی باتوں سے تو پھوٹی کھپریل کا بھی گھر نہیں بنتا۔"

جدید اور مفید تعلیم سے محرومی

مسلمانوں کی اس بُری حالت کو درست کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ یہ ہو سکتا تھا کہ تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ لیکن تمام مسلمان انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم سے اس قدر متنفر تھے کہ ۱۸۷۵ء میں بھی جب کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم بہت ترقی کر چکی تھی پورے ملک میں مسلمان گریجویٹس کی تعداد صرف بیس تھی جس میں سے سترہ بی۔ اے تھے اور صرف تین ایم۔ اے۔ اور جیسا کہ سرسید نے محسن الملک کو لکھا تھا مسلمانوں کی اس زبوں حالی کو بعض غیر مسلم بھی ان کے لئے بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ الہ آباد کے اخبار "پانیر" نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "آج کل ہندوستان میں مسلمانوں کے اعلیٰ خاندان روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ اور تمام سلطنت کے ملازمین میں صرف بنگال میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں اور جلد پنشن لے لیں گے۔ اور ان کی جگہ کوئی مسلمان نہیں ہوگا۔" لیکن مسلمان اس صورتِ حال سے غفلت برت رہے تھے۔ وہ اپنے قدیم علوم پر فخر کرتے اور ان کی تعلیم کو کافی سمجھتے تھے اور تعلیم کے بارے میں ان کا یہ عام رجحان بھی ان کی معاشری پستی اور افلاس کا

ایک بڑا سبب بن گیا تھا چنانچہ تمام حالات پر غور کرنے کے بعد سرسیدؔ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں۔ اور حسب احتیاجِ وقت نہیں ہیں۔ اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے۔ کیونکہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے۔ اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں۔ اس لئے کسان سے نہ لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود کچھ اپنا بھلا کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم کہ حسب احتیاجِ وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند آدمی کا قول ہے اگر حسبِ احتیاج وقت لوگوں کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اوّل مفلس اور محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور و بدمعاش ہو جاتے ہیں۔[۸]

اس غلط رجحان کے علاوہ پوری قوم کو تعلیم دینے کی ضرورت سے بھی مسلمان ناواقف تھے اور کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ عوام میں اچھی بُری کسی قسم کی بھی تعلیم حاصل کرنے کی نہ تو استطاعت تھی اور نہ اس کا انتظام تھا۔ سرسید کے نزدیک تعلیم معاشرہ کی اصلاح کا مؤثر ترین ذریعہ تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ دولت مند مسلمان اس ضرورت کو محسوس کریں۔ چنانچہ دولت مند طبقہ کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے انھوں نے یہ کہا تھا کہ جب اولاد کی تعلیم و تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے۔ اور خود اپنی اولاد کے ساتھ دشمنی ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بدہوا سے پاک نہ ہو تو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔[۹]

ہمدردوں کا غلط رویّہ

مسلمان قوم کی حالت نہایت خراب ہو چکی تھی اور ان کے مستقبل کو زیادہ تاریک بنا دینے والی خرابی یہ تھی کہ پوری قوم کو اپنی زبوں حالی کا احساس اور ترقی کا خیال نہ تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو یہ تسلیم کرتے تھے کہ ترقی و اصلاح کی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی رائیوں کی

اصلاح کے بجائے دوسروں کی کمزوریاں بیان کردینا کافی سمجھتے تھے۔ یہ طرزِ عمل بہت غلط تھا اور اس کے متعلق سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہمارے بعض محبِ وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی ترقی چاہتے ہیں غلطی میں پڑجاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی مہذب و تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں تو ہماری قوم کو کیوں بُرا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر ہم کسی دوسرے کی آنکھ کی پھلّی کو ٹوکیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہئے، دوسرے کی آنکھ میں پھلّی ہو یا نہ ہو۔ بااین ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصافانہ بھی نظر نہیں کرتے اور قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جس قوم کے کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں ہماری قوم میں وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیر خواہی قوم کی یہی ہے کہ اس کے عیبوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں ان کا دل اپنی قوم کی حالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرفداری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں بہت زیادہ جلتا ہے اور حقیقت میں وہی لوگ محبِ وطن اور محبِ قوم ہیں۔[۱۰]

سرسید کا انتباہ

سرسید اپنی قوم کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والے محبِ وطن نہ تھے بلکہ وہ اپنی قوم کے ایسے محب اور خیر خواہ تھے جو ان عیبوں کو مٹانا قوم کی صحیح خدمت تصور کرتے تھے اور جن کو قوم کی حالت بے چین و بے قرار کردیتی تھی۔ اس لئے وہ قوم کی تباہ حالت کو دیکھ کر پکار اٹھے کہ "افسوس ہندوستان کے مسلمان ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! دوا مرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! وہ ہاتھ پکڑنے

136135

والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر اسکے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی فکر کرو اور جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے اور اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ ہے[۱]۔" ہندوستان کے مسلمان زوال پذیر اور تباہ حال تھے۔ طرح طرح کے مصائب و مشکلات میں مبتلا تھے۔ ان کا مستقبل ان کے حال سے بھی زیادہ تاریک نظر آتا تھا۔ لیکن ان کو اپنی اس بُری حالت کا صحیح طور پر احساس نہ تھا۔ اور نہ تو وہ اپنی حالت درست کرنے کی کوشش کرتے تھے نہ ان کو اپنی اولاد کا مستقبل بہتر بنانے کی فکر تھی۔ قوم کی اس بے حسی نے سرسیّد کو بے چین کر دیا تھا اور اُنھوں نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی کہ "تمھاری حالت تمھارے باپ دادا کی حالت سے زیادہ خراب ہے اور تمھاری اولاد کی حالت تم سے بھی بہت زیادہ بدتر اور ابتر ہوگی۔ اور اگر تم اس کی فکر نہ کروگے تو تمہاری ارواح قبر میں بھی ان کے لئے روویں گی[۲]۔"

قوم کی بھلائی کے لئے یہی تڑپ اور سچی محبت تھی جس نے سرسید کو معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کی جدوجہد پر آمادہ کیا۔ اور اُنھوں نے جدید و مفید علوم کی اشاعت۔ دینی عقاید اور اخلاق و عادات کی درستی۔ رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت کی اصلاح و ترقی۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اتحاد و تعاون۔ مذہبی رواداری اور حقوق و فرائض کا تحفّظ و احترام جیسے اہم امور پر توجہ کرکے اپنی اصلاحی سرگرمیوں کو ایک ایسی منظّم اور کامیاب تحریک بنا دیا جس نے مسلمانانِ ہند کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا۔

حوالے:

۱۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ صفحہ ۴۵۱ و ۴۵۲

۲۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی۔ علی گڑھ۔ ۷ اپریل ۱۸۷۶ء

۳۔۴۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۵۳۷ تا ۵۵۲

۵۔ مسافرانِ لندن۔ سفرنامہ سید احمد خان (مجلسِ ترقی ادب لاہور) صفحہ ۵۱
۶۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۴۲۸
۷۔ خطوط سرسید۔ مرتبہ سید راس مسعود۔ خطوط بنام محسن الملک۔
۸۔ سرسید کے مضامین۔ تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۲۹
۹۔ مجموعہ لکچرہائے ڈاکٹر سید احمد خاں۔ مرتبہ سراج الدین احمد۔ تقریر پٹنہ۔ مئی ۱۸۷۳ء
۱۰۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ حصہ ششم۔ شمارۂ اوّل ۱۲۹۲ھ
۱۱۔ مسافرانِ لندن۔ صفحہ ۲۵۵۔
۱۲۔ مسافرانِ لندن۔ صفحہ ۲۷۷

دوسرا باب

معاشرہ کی اصلاح کا منصوبہ

ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں قوموں کی معاشری حالت اس قدر خراب تھی کہ ملک و قوم کے خیر خواہ فوری اصلاح کی ضرورت شدّت سے محسوس کرتے تھے۔ تاہم ہندوؤں کی حالت اس اعتبار سے بہتر تھی کہ ان میں راجہ رام موہن رائے، کیشب چندر سین، ایشر چندر ودیا ساگر، سریش چندر بھٹاچارجی، رام تنولا ہیٹری اور دیانند سرستی جیسے مصلح پیدا ہو گئے تھے جن کی کوششوں سے ہندو معاشرہ میں کئی خرابیوں کی اصلاح ہو گئی تھی۔ اور وہ زمانے کے تقاضوں کو محسوس کر کے اپنی معاشری تعلیمی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر پوری توجہ کر رہے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ سیاسی زوال کے بعد وہ اقتصادی حیثیت سے بھی تباہ ہو گئے تھے۔ جدید علوم حاصل کرنے پر کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے۔ معاشرہ میں ان کا وقار گر گیا تھا۔ اور غیر اسلامی رسوم و رواج اور دوسری قوموں کے اثرات نے مسلم معاشرہ کی حالت بگاڑ دی تھی۔ مدّت دراز سے مسلمانوں کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی تھی مگر سرسید سے پہلے ان کو کوئی ایسا مصلح نہ ملا تھا جو معاشری اصلاح کے لیے کامیاب جدوجہد کر کے تمام خرابیوں کو دور کرتا۔ اگرچہ اس زمانے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو معاشری اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے لیکن وہ خود اس میدان میں پیش قدمی کرنے پر تیار نہ تھے۔ اور اس بات کے خواہاں تھے کہ کوئی اور پہل کرے۔ کیونکہ ان میں بُری رسموں کو توڑنے اور اصلاح کرنے کی جرأت نہ تھی۔

سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ بُری رسموں اور رواج کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اصلاح کے خواہش مند پوری جرأت اور عزم و استقلال کے ساتھ ان کی مخالفت نہ کریں گے اور ان رسوم و رواج کے خلاف خود عمل کر کے دوسروں کے لئے قابلِ تقلید مثال قایم نہ کر دیں گے۔ سرسید کا یہی وہ نظریہ تھا جس کے مطابق اُنھوں نے معاشرہ کی ترقی و اصلاح کا کام شروع کیا۔ پہلے تو خود بُری رسموں کو چھوڑا اور اچھی باتیں اختیار کیں۔ پھر اپنے دوستوں اور ہم خیال لوگوں کو اس پر آمادہ کیا اور اس کے بعد پوری قوم کو اس کی ترغیب دی اور ان تمام تدبیروں سے کام لیا جو معاشرہ کی اصلاح و ترقی میں مدد دے سکتی تھیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ وہ آدمی نہایت کمینہ ہوتا ہے جو کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم یا لوگوں کے لعن و طعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ چنانچہ اُنھوں نے جب اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تو اس کو تحریر و تقریر اور محض زبانی تلقین تک محدود نہ رکھا بلکہ اُنھوں نے جو کہا اس پر عمل بھی کیا۔ معاشرہ کے لئے مضر اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرنے والی رسموں کو ترک کر دیا۔ اور اچھی رسموں کا آغاز کیا۔ مختلف فرقوں کے مسلمانوں سے برادرانہ تعلقات قائم کر کے دینی اخوت کی اہمیت و ضرورت واضح کی۔ ہندوؤں اور دوسری ہم وطن قوموں سے خوش گوار مراسم رکھے اور اپنی اصلاحی تحریک سے ان کو بھی فائدہ پہنچایا۔ انگریزوں سے میل جول بڑھایا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دوستی اور تعاون کا رجحان پیدا کر دیا۔ مسلمانوں کو غیر اسلامی عقائد و نظریات کی گرفت سے آزاد کرنے اور اسلام کے صحیح اُصول و مقاصد سے آگاہ کرنے کے لئے ان لوگوں کے خلاف زبردست مہم شروع کی جو مذہب کا نام لے کر گمراہی پھیلا رہے تھے۔ اور اس کام کی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان کی جو زبردست مخالفت کی اس کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ خود اپنی قوم میں جو بُرائیاں تھیں ان کو چھوڑ کر ترقی یافتہ قوموں کی خوبیاں اختیار

کیں۔ نئے علوم سے خود بھی ممکنہ حد تک واقفیت حاصل کی اور اپنے لڑکوں کو جدید طرز کی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اور مسلمانوں کی معاشری اصلاح اور تعلیمی ترقی کی تجویزوں کو زیادہ بہتر اور مفید طریقہ پر روبہ عمل لانے کے لئے یورپ کا سفر اختیار کیا جو اس زمانے میں کافی مشکل کام تھا۔ اس طرح سرسید نے معاشری اصلاح کے لیے لوگوں کے سامنے عملی مثال بھی پیش کر دی اور ان خرابیوں کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جو ان کے خیال میں معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی و اصلاح میں حائل تھیں۔

بنیادی مسائل ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشری زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کے بنیادی اسباب میں تین بہت اہم تھے۔ ایک تو مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت پر ہندوؤں کے اثرات۔ دوسرے مذہب و اخلاق میں گمراہ کن عقائد و نظریات کی پیدا کردہ خرابیاں اور تیسرے پوری قوم میں تعلیم کی کمی اور جدید علوم و فنون سے یکسر محرومی۔ ہندوؤں کے اثرات کی وجہ سے مسلمانوں نے ایسے رسوم و رواج اختیار کر لئے تھے جو دینی، اخلاقی، معاشری اور اقتصادی ہر اعتبار سے نقصان رساں تھے۔ ہندو معاشرہ میں ذات پات کی تفریق اور چھوت چھات کو بنیادی اہمیت حاصل تھی اور اس کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی ذاتیں اور برادریاں بن گئیں۔ اسلامی رواداری کے بجائے تعصب و تنگ نظری عام ہو گئی۔ دوسری قوموں کے ساتھ معاشری تعلقات کو معیوب خیال کیا جانے لگا اور عورتوں کی حق تلفی کر کے ان کو جائز حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ دینی عقائد میں خرابی پیدا ہو جانے سے اسلام کی صحیح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا گیا اور رسوم و رواج کو دینی اصول اور فروعات کو اصل دین سمجھ لیا گیا۔ اور پیری مریدی کی بگڑی ہوئی شکل عام ہو گئی۔ تعلیم کی کمی سے پیدا شدہ جہالت و تعصب اور کج فہمی کی بدولت جدید علوم و فنون کو معیوب اور مخالف مذہب سمجھا جانے لگا جس سے تہذیب و ثقافت کے علاوہ اقتصادی حالت پر بھی بہت برا اثر پڑا تھا۔ سرسید نے معاشری زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھا۔ اس میں کیا خرابیاں تھیں، ان خرابیوں کے کیا اسباب

تھے اور ان کو دور کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنے کی ضرورت تھی اس پر پوری طرح غور کر کے انھوں نے اصلاحی تحریک کا ایک خاکہ مرتب کیا۔ اور اس کے مطابق کام کرنے لگے۔

تہذیب اور ترقی کے محرکات

سرسید نے معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا کرنے کے لیے مہذب اور غیر مہذب معاشروں کا فرق واضح کیا۔ معاشری اصلاح کے لیے مہذب قوموں سے مناسب طور پر استفادہ کرنے کی اہمیت بیان کی۔ تہذیب اور اس کے محرکات کی وضاحت کی اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے جن امور میں تہذیب کی ضرورت ہے ان کو ایک لائحہ عمل کی شکل میں مرتب کیا۔ سرسید نے انسان میں قانونِ قدرت کے مطابق تہذیب کو ایک فطری چیز بتایا جو شہریوں اور وحشیوں سب میں کسی نہ کسی شکل میں پائی جاتی ہے اور تہذیب کی شکلوں میں یہ فرق ہی مہذب اور نامہذب ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ بُرے کو اچھا بنانا اور ادنیٰ سے اعلیٰ تک پہنچنا تہذیب کا محرک و مقصد قرار دے کر سرسید نے اس بات کی وضاحت کی کہ انسان میں ایک فطری بات یہ ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند۔ یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی چیز کو بُرا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ کسی بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن یا تہذیب کی جڑ ہے۔ اور اس تبادلے کا نام تہذیب ہے اور یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطری ہے۔ اس طرح اچھا یا بُرا، تہذیب کی طرف انسان کی فطرت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے اور بُرے کو اچھا کرنا تہذیب ٹھہری۔ اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خُلقی ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی تہذیب میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ بود و باش سے زیادہ انسان کے خیالات کو تہذیب سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہراتا ہے اور جس کے

باعث خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو تہذیب کہلاتا ہے۔ پس تہذیب کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کرتے ہیں جن کے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔ خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات پر اور علم میں بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی بڑھتی ہے۔

تہذیب، یا یوں کہنا چاہیے کہ بُری حالت سے اچھی حالت میں لانا، دُنیا کی تمام چیزوں سے، اخلاقی ہوں یا مادّی، یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں یکساں پایا جاتا ہے۔ لیکن مہذّب اور غیر مہذّب قوموں میں اس کی نوعیّت مختلف ہوتی ہے۔ اور اس نوعیت یا شکل میں اختلاف مہذّب اور نامہذّب ہونے کا معیار ہے۔ ایک ہی جذبہ مہذب اور نامہذب یا شہری اور وحشی لوگوں میں جس شکل میں ظاہر ہوتا ہے وہ ان کی تہذیب اور ترقی کا مظہر ہوتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہوتا ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ لیکن ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر، یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے اور ناتربیت یافتہ قوم کوڑیوں اور پتھروں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے رنگین پروں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے پوست اور باریک گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کے مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونپے، درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈا اور زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں ان کی تہذیب کی علامت ہوتی ہیں۔

جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس میں کہ ترقی برائی سے

اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک بھی شامل ہے۔ پس تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعالِ ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریقِ تمدن اور علوم و فنون کو بقدرِ امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہنچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔[1] سرسید کے نزدیک برائی کو اچھائی سے بدلنا اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھنا تہذیب کے مقصد و محرک اور ترقی کی علامت ہیں۔ اور جو معاشرہ برائیاں چھوڑ کر اچھائیاں اختیار کرنے اور ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے میں جس قدر کامیاب ہوگا وہ اسی قدر ترقی یافتہ اور مہذب بن جائے گا اور اپنے اسی نظریہ کے مطابق انھوں نے تہذیب کی اصلاح و ترقی کے لیے کوشش کی۔

مہذب اور غیر مہذب میں فرق

سرسید کے خیال میں معاشرہ کی ترقی و اصلاح کے لیے یہ ضروری اور مفید ہے کہ کم ترقی یافتہ یا نامہذب قومیں ترقی یافتہ اور مہذب قوموں کی معاشری خوبیوں سے فائدہ اٹھائیں اور جن باتوں میں ضروری اور مناسب ہو ان کی پیروی کریں۔ وہ اس حقیقت کو بخوبی محسوس کرتے تھے کہ مغرب کی ترقی یافتہ اور مہذب قوموں میں بھی برائیاں ہیں اور ان کی پیروی کرنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی خوبیوں کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ سرسید قدامت پرستوں کی اس عادت کے سخت خلاف تھے کہ جب کہیں ترقی یافتہ قوموں سے فائدہ اٹھانے کا ذکر آتا تو وہ ان کی خرابیوں کو بڑے زور شور سے بیان کرنے لگتے اور ان کی بے شمار خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ جاتا تھا کہ ہندوستان کے لوگ ترقی یافتہ قوموں کی خوبیوں کی پیروی کریں نہ کہ برائیوں کی۔ مہذب اور نامہذب قوموں کے

فرق کو بیان کرتے ہوئے سرسید نے بارہا یہ واضح کیا کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مہذب قوم میں کوئی نقص یا عیب یا برائی نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ برائیوں کے ساتھ لاکھوں، کروڑوں اچھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر نامہذب قوم میں بجز برائیوں کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ نامہذب قومیں گناہ کو ایسے بُرے طور سے استعمال کرتی ہیں جس سے اس گناہ کی بدیاں بہت زیادہ عام اور تمام قوم کو خراب کرنے والی ہو جاتی ہیں۔ لیکن مہذب قومیں اگرچہ وہی یا اسی قسم کا گناہ کرتی ہیں مگر وہ اس طرح پر وقوع میں آتا ہے کہ اس کی بدی عام ہونے نہیں پاتی۔ اور پوری قوم کو غارت و تباہ نہیں کرتی۔ نامہذب قوم نیکی بھی ایسی بُری طرح کرتی ہے کہ یا تو وہ نیکی نیکی نہیں رہتی یا غیر مفید اور بے محل ہو جاتی ہے۔ مہذب قوم جو نیکی کرتی ہے وہ ایسے سلیقے اور خوبی سے کرتی ہے کہ وہ نیکی زیادہ عمدہ اور بہت مفید اور بر محل ہوتی ہے۔ نامہذب قوموں میں اعتدال نہیں ہوتا۔ وہ نیکی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو اس کو اتنا کھینچتی ہیں کہ ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور بدی کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو اس کو اتنا بڑھاتی ہیں کہ شیطان کے بھی کان کاٹتی ہیں۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ اگر کسی مہذب قوم کا ذکر ان کے سامنے کرو تو اس قوم کی بُرائیوں اور عیبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ کون کہتا ہے کہ مہذب قوموں میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ مگر یہ تو دیکھو کہ ان میں ان عیبوں کے ساتھ بہت بھلائیاں اور خوبیاں بھی ہیں۔[۲]

مہذب قوم کی پیروی کے اصول

نامہذب قوم کو تہذیب یافتہ قوم کی پیروی اسی طرح کرنی پڑتی ہے جس طرح کہ ایک چھوٹا بچہ اپنے سے بڑے لڑکے اور اپنے بزرگوں کی باتوں کی پیروی کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پیروی اندھا دھند ہوتی ہے تو اس سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ نامہذب آدمی جب تربیت یافتہ قوم کی صحبت میں جاتا ہے تو ان لوگوں کو بہت عمدہ پاتا ہے۔ اور ہر بات میں ان کو کامل سمجھتا ہے۔ اور ان میں جو خراب

عادتیں دیکھتا ہے ان کو بھی ان کے کمالوں ہی میں تصور کر لیتا ہے ایسا شخص ترقی یافتہ قوموں کی خوبیوں اور کمالات کو تو نہ حاصل کرتا ہے اور نہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جو بُری باتیں ہیں ان کو بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا درحقیقت اس آدمی کی غلطی ہے۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے کمال و لیاقت و خوبی اور اپنی عمدہ خصلتوں کی وجہ سے مہذب و شائستہ کہلاتی ہیں نہ کہ ان بُرائیوں کی وجہ سے جو نامہذب آدمی سیکھ لیتا ہے۔ مہذب آدمیوں کی بُرائیاں ان کی بہت سی خوبیوں اور کمالوں کے سبب سے چھپ جاتی ہیں اور لوگ ان پر بہت کم خیال کرتے ہیں لیکن کسی قوم میں خواہ وہ کیسی ہی عمدہ اور مہذب ہو جو بُرائیاں ہوتی ہیں وہ وصف نہیں بن جاتیں۔ چنانچہ سرسید نے اپنی قوم سے یہ خواہش کی کہ وہ مہذب قوموں کی ان خوبیوں کی پیروی کریں جن کے سبب وہ معزز اور قابلِ ادب اور مہذب شمار ہوتی ہیں اور ان باتوں کی پیروی ہرگز نہ کریں جو ان کے نقائص ہیں[۳]۔

مہذب قوم کی پیروی کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں سرسید کا یہ بنیادی اصول تھا اور ان کی اصلاحی تحریک بھی اسی اصول پر مبنی تھی۔ اور انھوں نے معاشری ترقی کے لیے جن امور کو اپنے پروگرام میں شامل کیا ان میں اس بات کو پیشِ نظر رکھا کہ مہذب قوموں کی خوبیوں اور ترقی و کمال سے استفادہ کیا جائے۔

معاشری اصلاح کا خاکہ

تہذیب و ترقی کے یہ وہ محرکات اور اُصول تھے جو سرسید نے پیشِ نظر رکھے۔ کسی قوم کو مہذب بنانے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے معاشرہ کی ترقی و تہذیب میں کن اُصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ اور مہذب قوموں سے کس حد تک استفادہ کرنا ضروری ہے اس کا ان کو بخوبی اندازہ تھا اور اُنھوں نے معاشری اصلاح کی جو تحریک شروع کی اس میں ان باتوں کا مناسب لحاظ رکھا۔ یوں تو ہندوستان کی تمام قوموں کی معاشری حالت اصلاح طلب تھی لیکن مسلمانوں کے

معاشرہ میں سب سے زیادہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ اور انہی کی اصلاح کرنا سرسیّد کا اوّلین مقصد تھا۔ کسی قوم کو تہذیب و ترقی کی طرف مائل کرنے اور اس کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اس کو یہ بتلانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کو کن چیزوں کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ چنانچہ سرسیّد نے مسلمانوں کی دینی، معاشری اور اقتصادی اصلاح کے لیے ایک خاکہ مرتب کیا اور مندرجۂ ذیل امور کی اصلاح پر مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

۲۹ نکات

۱۔ **آزادی رائے۔** مسلمانوں کی رائے اور اُن کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے پست اور پامال ہو گئے ہیں جن کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک اُن میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی اُن میں پیدا نہ ہوگی اس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

۲۔ **درستی عقائد مذہبی۔** ہندوستان کے مسلمانوں کے عقاید مذہبی جو اُن کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کا اُن کو یقین بیٹھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقاید شرکیہ اُن کے دلوں میں ہیں پس اُن کی تہذیب کرنا اور اپنے عقاید کو ہیئت اسلام کے مطابق کرنا اور اُس پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

۳۔ **خیالات و افعال مذہبی۔** ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعالِ مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو مذہبِ اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالات کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے اُن کی تہذیب درکار ہے۔

۴۔ **تدقیق بعض مسائلِ مذہبی۔** ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسائل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی اور اگرچہ وہ مسائل فی نفسہٖ صحیح و درست ہیں الّا بیان واضح اور تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علومِ عقلیہ

کے برخلاف اور تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو اُن کی تشریح و تہذیب کرنی چاہیئے۔

۵۔ تصحیح بعض مسائل مذہبی۔ ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں۔ یا یوں کہو بعض ایسے مسائل کا ہونا ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ پس اُن کو بحث میں لانا اور ایک منقح ٹھہرانا ہمارے لئے ضروری ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اُتنا ہی اُس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

۶۔ تعلیم اطفال۔ مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کر کے ایسا طریقہ تعلیم متعین کرنا چاہیئے۔ جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

۷۔ سامانِ تعلیم۔ ہمارے لئے صرف طریقۂ تعلیم متعین کرنا ہی کافی نہ ہوگا۔ بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اُس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضروری ہوگا۔

۸۔ عورتوں کی تعلیم۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب اور شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور اُن کو دستکاری سکھانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے۔

۹۔ ہنر و فن و حرفہ۔ اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا و ترقی دینا قومی تہذیب کے لئے ایک بڑا جزو ہے۔

یہ تمام باتیں وہ ہیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں مگر اُن کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے۔ اور ہر ایک میں اُن باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب و شائستگی قرار پاتی ہے۔

۱۰۔ خود غرضی۔ سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مذموم سبب قومی ذلت و نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہِ عام کا جوش دل میں پیدا کریں۔ اور یقین جانیں خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہو گی۔

اس مقام پر ہم کو ایک کہانی یاد آئی۔ انسان کے اعضاء میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا پاؤں نے کہا میں چل کر کیوں غذا بہم پہنچاؤں۔ ہاتوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منہ تک پہنچائیں۔ آنکھوں نے کہا کہ ہم اس میں کی بال مکھی کیوں دیکھیں۔ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا ندا ہونا میں کیوں سونگھوں۔ مُنہ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں۔ سب آپ آپ چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں جوں گذر گئے۔ پھر تو پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ ہاتھ کانپنے لگے۔ مُنہ ہلانے کی طاقت نہ رہی۔ آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا۔ تب تو سب گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اُس وقت عقل کے پاس گئے۔ اُس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے حالانکہ حقیقت میں وہ تمہارا ہی کام تھا اور اُس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ پس جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے جیسے ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے تو وہ اب آپ اپنے تئیں برباد کرتے ہیں۔

۱۱۔ عزّت اور غیرت۔ غیرت اور عزّت یہ دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جُدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزّت ہے اُس کو غیرت ہے۔ جس کو غیرت ہے اُس کو عزّت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں۔ اگرچہ میری اس بات سے لوگ متعجب ہونگے کہ مسلمان کیونکر ایسے ہیں۔ اگر ایسی ان کو کوئی گالی دے جان نکال لیں مر جائیں پر اپنی شان نہ جانے دیں۔ شادی مہمانی میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں۔ روپیہ قرض لیں اور شادی دھوم دھام سے کریں۔ مگر باوا مر گیا ہے تو اس کی فاتحہ اور چہلم کی تو وہ پابندی میں کبھی دریغ نہ کریں۔ پھر

کیوں کر اُن کو اپنی عزت یا غیرت کا خیال نہیں ہے۔ یہ سب باتیں سچ ہیں۔ مگر یہ سب شیطانی اور جھوٹی عزّت اور غیرت ہے۔ جو اصلی اور اخلاقی عزت ہے ہم اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال نہ کرے۔ کس کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں سچ کی عزّت کو بٹہ نہ لگائیں۔ کون ہے جو بلحاظ اپنی اخلاقی عزّت کے کسی بُرائی کے فعل سے بشرطیکہ اُس میں سزائے دُنیاوی کا اندیشہ نہ ہو بچ کر اپنے تئیں معزز رکھنا چاہتا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ اور قوموں میں یہ نقص نہیں ہے مگر بلاشبہ اتنا کہتے ہیں کہ مہذّب و شائستہ قوموں میں نہ خدا کے ڈر سے بلکہ اپنی عزّت کے ڈر سے ان باتوں کا بہت خیال ہے۔

۱۲۔ ضبطِ اوقات۔ ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنے خاص اوقات کو اور جو کام عام قوم سے متعلق ہیں ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیئے کہ یہ ہی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

۱۳۔ اخلاق۔ بالفعل مدارِ اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جس کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں۔ دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنائیں۔ کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا۔ کچھ اُن کی جھوٹی تعریف کی آؤ بھگت کی۔ اور دل میں کہا کہ خوب اُلّو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو بُرا کہنے لگے۔ یا جو باتیں کی تھیں ان کا نقش برآب کا سا بھی نشان نہ تھا۔

یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اُس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہ ہم کو سب سے جُھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیئے۔ مگر وہیں تک جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضا ہے مگر اس کو مکاری کی حد تک نہ پہنچانا چاہیئے۔

۱۴۔ صدقِ مقال۔ یہ تو وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب و ابدال کے

درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے تاکہ قائل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنہ کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے۔ جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب و ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔

۱۵۔ دوستوں سے رسم و راہ۔ ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے، اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے حیوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا ضروری امر ہے۔

۱۶۔ کلام۔ طرزِ گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں نہایت کم مستعمل ہیں۔ اس لئے اس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔

۱۷۔ لہجہ۔ اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکھڑ لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔ کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

۱۸۔ طریق زندگی۔ یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریقِ زندگی ہمارے طریقۂ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

۱۹۔ صفائی۔ بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ خدا اور خدا کے بعد صفائی۔ مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث

ہے۔ الطہور شطر الایمان۔ مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں۔ صورت دیکھو تو واہ واہ۔ گھر دیکھو تو سبحان اللہ۔ اس لئے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

۲۰۔ طرزِ لباس۔ لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑی نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھ لو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا چلا گیا اسی قدر لباس کی درستی ہوتی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیئے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

۲۱۔ طریقِ اکل و شرب۔ اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریق اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں جب ہم کو کھاتے دیکھتی ہیں تو اُن کو قے آتی ہے۔

۲۲۔ تدبیرِ منزل۔ ہماری تدبیرِ منزل یعنی انتظامِ خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

۲۳۔ رفاہ عورتوں کی حالت میں۔ غیر قوموں نے ہمارا برتاؤ جو عورتوں کے ساتھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں ہیں۔ مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہے، وہ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

۲۴۔ کثرتِ ازدواج۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کم ہے مگر پھر بھی زیادہ ہے۔ اور نہایت نالائقی سے خدا و خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی و بدنامی ہے۔

۲۵۔ غلامی۔ اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت غلامی کی بد رسم موقوف ہو گئی ہے۔ مگر ہمارے مہذب و شائستہ ہونے کے لیے صرف اس کا موقوف ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے

کہ درحقیقت یہ رسم خلاف مسلمانی مذہب کے تھی اور فی نفسہ خراب و نالائق تھی۔ اس لئے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۶۔ رسوماتِ شادی۔ جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں ایک بھی اُن میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشائستہ اور نامہذب ہوگی۔

۲۷۔ رسوماتِ غمی۔ اسی طرح رسوماتِ غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے نامہذب و ناشائستہ رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ خدا رحمت کرے مولوی اسماعیل پر۔ جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشائستہ رسمیں شادی و غمی کی ہم میں سے چھوٹ گئی ہیں۔ مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہیں جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیئے۔

۲۸۔ ترقیٔ زراعت۔ زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے۔ اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

۲۹۔ تجارت۔ یہ سب سے آخری جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا۔ اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہو گیا ہے۔ پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصول پر اس کو قائم کرنا ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کے ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ یہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیونکر ہو سکتی ہے اس لئے کہ اگر ہم متوجہ ہونگے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے پر دل لگا دینگے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں کہ جب ایک بات میں ترقی شروع ہوتی ہے تو ہر ایک بات میں از خود ہو جاتی ہے۔ پر کوشش شرط ہے۔

سرسید کے اصلاحی پروگرام میں تعلیم کی بنیادی اہمیت تھی۔ کیونکہ وہ

جانتے تھے کہ بیشتر خرابیاں جہالت اور غلط تعلیم کی پیدا کردہ ہیں۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم نہایت فرسودہ اور بیکار تھا۔ طریقۂ تعلیم میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ نئے زمانے کے لیے بالکل کارآمد نہ تھیں اور ان کو پڑھنا محض وقت ضائع کرنا تھا۔ اس لئے سرسید نے اصلاح تعلیم کا ایک انقلابی پروگرام بنایا۔ تاکہ طریقۂ تعلیم کو بدل کر جدید قسم کے مدارس اور کالج قائم کئے جائیں۔ جہاں نئے علوم و فنون کی تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم اور تربیت کا بھی مناسب لحاظ رکھا جائے۔ اس مقصد کے تحت سرسید نے انگلستان کے طرزِ تعلیم کا مطالعہ کرنا ضروری خیال کیا اور اس ملک کے تعلیمی اداروں کو دیکھنے کے بعد مسلمانوں کے لیے جدید طرز کا ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ ان کے اصلاحی پروگرام کا نہایت اہم حصہ تھا اور انھوں نے اپنی تمام کوششیں اس مقصد کی تکمیل پر مرتکز کر دیں۔

تعلیم کی نوعیت کو بدلنا اور اس کو ترقی دینا۔ دینی عقاید کو درست کرنا۔ اخلاق و عادات کو سنوارنا۔ تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کی خرابیاں دور کرنا۔ رسوم و رواج کی برائیوں کو مٹانا۔ عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا اور ملی اخوت، قومی اتحاد اور مذہبی رواداری کا احساس بیدار کر کے معاشرہ میں یک جہتی و ہم آہنگی پیدا کرنا سرسید کی اصلاحی تحریک کے خاص مقاصد تھے اور اس کے حصول کے لیے انھوں نے بہت منظم جد و جہد کی۔

تہذیب الاخلاق

سرسید نے مسلمانوں کی معاشری اصلاح کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کی تجاویز کو عملی شکل دینے، تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کی اشاعت کرنے اور تمام اصلاح طلب امور اور پیش نظر مسائل کے متعلق مضامین شائع کر کے معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی ضرورت و اہمیت لوگوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے ایک ایسا رسالہ جاری کرنا ضروری تھا

جو سرسیّد اور ان کی اصلاحی تحریک کے مقاصد و نظریات کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ اس ضرورت کو سرسیّد نے پہلے بھی محسوس کیا تھا لیکن انگلستان میں قیام کے دوران میں جب ان کو یہ اندازہ ہوا کہ اس ملک کی ترقی و اصلاح میں وہاں کے جرائد نے کس قدر مفید اور اہم حصّہ لیا ہے تو انھوں نے ہندوستان واپس ہونے کے بعد ایک رسالہ جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور اس کے لئے کچھ تیاریاں بھی کرنے لگے[۵]۔ چنانچہ اس بارے میں نواب محسن الملک کو لکھا تھا کہ "ہندوستان پہنچ کر ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدہ کے لیے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں "محمڈن سوشل رفارمر" رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے۔ اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دی ہیں تاکہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جائیں۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہونگے اور کچھ نہیں ہوگا"[۶]۔

مقاصدِ اجرا تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ یکم شوال ۱۲۸۷ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس پرچہ میں سرسیّد نے یہ رسالہ جاری کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ اس کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سولزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سولائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو۔ اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلا دیں۔ سولزیشن یا تہذیب کے معنی نہایت وسیع ہیں اور اس سے مراد ہے انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت، تمدّن اور طریقۂ تمدن اور صرفِ اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہنچانا۔ اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے۔ اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے۔ اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں

تمیز نظر آتی ہے۔

تہذیب و معاشرت کی اصلاح کے اس پروگرام میں دینی عقائد کی اصلاح کو سرسید نے بہت اہمیت دی تھی۔ کیونکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کو پورے معاشری نظام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے یہ وضاحت کی کہ یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بے شک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قومی کے بڑے مانع ہیں۔ پس ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا مسلمانی مذہب بھی ایسا ہے۔ ایک متعصب عیسائی مؤرخ نے مذہب اسلام کو انسانی تہذیب میں مانع قرار دیکر یہ کہا تھا کہ ترک جب تک اسلام کو نہ چھوڑیں گے مہذب نہ ہوں گے۔ چنانچہ گورنمنٹ ترکی نے چند علماء اور عقلاء کی کونسل اس امر کی نسبت رائے لکھنے کو مقرر کردی۔ اور اس کونسل نے یہ رائے لکھی کہ اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال کے درجہ پر پہنچانے والی ہیں۔ مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہوگئی ہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ مسلمان اپنی تہذیب و تربیت اور شائستگی کی طرف اسی وقت متوجہ ہو سکتے ہیں جب وہ بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں اور جو رسومات و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں۔ اور کیوں کر ہم میں مل گئیں۔ یا کیوں کر خود ہم میں پیدا ہو گئیں۔ اور ان میں جون جون سی ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں ان کو ترک کریں۔ اور جو قابلِ اصلاح ہوں ان کی اصلاح کریں اور ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جائیں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق شریعت بیضا کے ہے یا نہیں۔ تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچیں کہ اس سے زیادہ ثواب کا کوئی کام اس زمانے میں نہیں ہے۔ یہی ہمارا

مطلب اپنے ہندوستانی بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں۔ ان سے ان کو مطلع کریں۔ اور جو عمدہ باتیں ان میں ہیں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلائیں۔"

ہندوستان میں معاشری اصلاح کے لیے سرسیّد تہذیب الاخلاق سے وہی کام لینا چاہتے تھے جو اسٹیل اور ایڈیسن نے انگلستان میں ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر سے لیا تھا۔ سرسیّد ان دونوں کے مفید اثرات اور معاشری اصلاح میں کامیابی سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے تہذیب الاخلاق کے پیش نظر مقاصد میں یہ بیان کیا کہ "جب ہم کچھ اوپر پچھلے ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں ہے۔ اور وہاں بھی اس زمانے میں اس قسم کے پرچے جاری ہوئے تھے جن کے سبب تمام چیزوں میں تہذیب و شائستگی پیدا ہوئی تھی۔ ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق اور عادات اور دینداری کو نہایت فائدہ پہنچا۔ اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا۔ ان پرچوں سے صرف علم ادب اور انشا ہی میں ترقی نہیں ہوئی بلکہ اخلاق اور عادت اور خصلت کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ نیکی کے برتاؤ میں جو خود انسان کی اپنی ذات سے اور اپنے خویش اور اقربا، دوست آشنا، یگانہ و بیگانہ سے علاقہ رکھتی ہے نہایت اعلیٰ درجہ کی تہذیب حاصل ہوئی۔ اور خود تہذیب و شائستگی کو ایسی عمدہ صیقل ہوئی جس کی آج تک کوئی نظیر نہیں۔"

رسالہ کی اشاعت یہ رسالہ تین سلسلوں میں جاری کیا گیا یکم شوال ۱۲۸۷ھ (۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) کو تہذیب الاخلاق پہلی مرتبہ شائع کیا گیا اور اور چھ سال تک جاری رہا۔ اس سلسلہ کا آخری شمارہ یکم رمضان ۱۲۹۳ھ (۲۰ ستمبر ۱۸۷۶ء) کو نکلا اور اس کے بعد تین سال تک بند رہا۔ دوسرے دَور کا پہلا پرچہ یکم جمادی الاوّل ۱۲۹۶ھ (۲۳ اپریل ۱۸۷۹ء) کو نکلا اور آخری شمارہ یکم رمضان ۱۲۹۸ھ (۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء) کو شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ رسالہ بارہ سال تک بند

رہا۔ معاشری اصلاح کی جدوجہد میں رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت سے بڑی مدد ملی تھی اور اس کو پھر جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۹۲ء میں مولوی نذیر احمد نے ایجوکیشنل کانفرنس میں یہ رسالہ پھر جاری کرنے پر بہت زور دیا اور آخر کار یکم شوال ۱۳۱۱ھ (۷ اپریل ۱۸۹۴ء) کو تیسرے دور کا پہلا شمارہ شایع ہوا۔ اور یکم رمضان ۱۳۱۴ھ (۲ فروری ۱۸۹۷ء) کو اس سلسلہ کا آخری پرچہ نکلا اور اس کے بعد یہ رسالہ بالکل بند ہوگیا۔ تہذیب الاخلاق کے مضمون نگاروں میں سب سے زیادہ سرگرم خود سرسید تھے۔ جو مذہب، اخلاق اور معاشرت پر بڑے فکر انگیز مضامین لکھتے تھے۔ سرسید کے علاوہ محسن الملک، چراغ علی اور مشتاق حسین بھی اس کے خاص مضمون نگار تھے۔

ردِّ عمل تہذیب الاخلاق کے جاری ہوتے ہی قدامت پرست عناصر نے اس کی شدید مخالفت شروع کردی۔ اس کے مضامین کو گمراہ کن قرار دیا۔ کئی اخبار اس کی مخالفت میں جاری کئے گئے۔ اور اس کے مضامین کے جواب میں اور سرسید کی تحریک کے خلاف مضامین شائع ہونے لگے۔ سرسید کی تکفیر کے فتوے دیے گئے اور ان کے رفقاء کو بھی نیچری اور کرسٹان کہا جانے لگا۔ اس زمانہ کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ مخالفت بالکل متوقع تھی۔ تہذیب الاخلاق کے جاری ہونے کا مفید نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید کی اصلاحی تحریک چند سال میں پورے ملک میں پھیل گئی۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کا ایک معتدبہ گروہ ایسا بن گیا جو اس کے مضامین سے بہت متاثر ہوا تھا اور معاشری اصلاح کی ضرورت و اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتا تھا۔ اس گروہ کے تعاون اور امداد سے سرسید اپنی کوششوں میں بہت کچھ کامیاب ہوئے اور ان کی تحریک کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں۔

اصلاحی کوششیں سرسید کی اصلاحی تحریک کی راہ ہموار کرنے اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے تہذیب الاخلاق سے جو کام لیا گیا اس کا ذکر خواجہ الطاف حسین حالی نے یوں کیا ہے کہ اس

پرچہ کی تمام تر کوشش اس بات میں تھی کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن کے مذہبی مانع سمجھے جاتے تھے لیکن درحقیقت مذہب سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ان کو جہاں تک ہو سکے رفع کیا جائے۔ اور اسلام پر عیسائیوں کا جو یہ اعتراض ہے کہ وہ ترقی اور تمدن کا دشمن ہے اس غلطی کا اصل منشا ظاہر کیا جائے۔ اس کے علاوہ یورپ کی تہذیب کے اصول و فروع سے اور ان اسباب سے جو یورپ کی ترقی کے باعث ہوئے ہیں قوم کو آگاہ کیا جائے۔ بیہودہ اور مضر رسموں سے ان کو نفرت دلائی جائے۔ اخلاق و عادات میں جو بسبب قومی تنزل کے خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ بیان کی جائیں۔ علومِ قدیمہ کی عظمت جو لوگوں کے دلوں میں حد سے زیادہ بیٹھی ہوئی ہے جہاں تک اس میں غلطی ہو اس کو ظاہر کیا جائے۔ علوم جدیدہ جن سے نفرت کی جاتی ہے ان کی اصل اور واقعی خوبیاں اور جو بدیہی نتائج دنیا میں ان سے پیدا ہوئے ہیں جتائے جائیں۔ اور بجائے نفرت کے ان کی طرف رغبت دلائی جائے۔ اسلام میں مخالفوں نے جو باتیں تاریخی اور علمی تحقیقات کے خلاف بیان کی ہیں ان کو تاریخ اور علم کے ساتھ منطبق کیا جائے یا اسلام کا دامن ان سے پاک ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے اکابر و اسلاف کی عظمت کا خیال پیدا کیا جائے۔ ان کی قدیم علمی اور عملی ترقیات ان کو یاد دلائی جائیں۔ اور اس طرح قوم کے مُردہ دلوں کو از سرِ نو زندہ کرنے میں کوشش کی جائے[۱۱]۔ یہ بڑے اہم لیکن نازک مسائل تھے اور سرسید نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ان تمام اغراض و مقاصد کے پورا کرنے کے لیے صرف اپنی رائے اور اجتہاد ہی سے کام نہ لیا جائے بلکہ جو کچھ مذہب کے متعلق لکھا جائے وہ زیادہ تر قوم کے محققین کی تصنیفات سے استفادہ کر کے لکھا جائے اور اخلاق و معاشرت و ترقی و تمدن کے متعلق مصنفین کے خیالات بھی جہاں تک ہو سکے اپنی زبان میں بیان کئے جائیں۔

خدمات اور ان کی نوعیت

تہذیب الاخلاق ایک زوال پذیر اور تباہ حال قوم کی ترقی و اصلاح کے لیے نکالا گیا

تھا۔ اور اس نے ان لوگوں کی رہبری کی جو اپنی قوم کی زبوں حالی کا احساس رکھتے تھے اور دینی و معاشری زندگی کی درستی اور بھلائی کے خواہاں تھے۔ اس رسالہ نے قوم کی جو خدمات انجام دیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے سرسید نے ان حقائق کا اظہار کیا ہے کہ "ہم نے اپنی قوم کی موجودہ بُرائی اور ان کی آیندہ بھلائی جہاں تک کہ ہو سکی ان کو دکھائی۔ مذہبی نقائص جو اُنھوں نے یہود و نصاریٰ کی روایتوں سے اور ہندوؤں کے میل جول سے اختیار کئے ہیں۔ بدرسم و رواج جو ان میں شامتِ اعمال سے پڑ گئے ہیں۔ اخلاق کی برائیاں جو ان میں خرابیٔ تربیت سے آ گئی ہیں۔ ان کی کتب مروجہ تعلیم کی خرابیاں جن سے وہ کتابیں بے سود ہو گئی ہیں سب کچھ ان کو بتلایا ہے۔

"علمِ ادب اور علمِ انشاء سے بھی ہم نے غفلت نہیں کی۔ کیونکہ ہم نے اپنے آرٹیکلوں کو اس طرزِ جدید صاف و سادہ پر لکھا ہے جو دل میں سے نکلنے والی اور دل میں بیٹھنے والی ہے۔ اور ہم نے یورپ کے نامی عالموں کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے۔ اس پرچہ نے لوگوں کے دلوں پر بھی کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے۔ ہماری قوم کے دل جو مُردہ ہو گئے تھے ان میں ایک تحریک آ گئی ہے۔ اور ہر ایک دل میں کسی نہ کسی بات کا جوش ہے۔ کوئی ہماری تحریروں کو سراہتا ہے اور کوئی سراہنے والوں کو لعنت ملامت کرتا ہے۔ نہایت خوشی کی بات یہ ہے کہ بہت لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ بلاشبہ ہماری قوم خراب ہوتی جاتی ہے اور اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ہماری کوششوں نے مسلمانوں کی تعلیم پر نمایاں اثر کیا ہے۔ اب جس مسلمانی مدرسہ میں جاتے ہیں اور جن طالب علموں سے ملتے ہیں اتنی بات ضرور سنتے ہیں کہ جو طریقۂ تعلیم بالفعل مقرر ہے وہ بلاشبہ تبدیل کے لائق ہے۔ بہت سی کتابیں ایسی درس میں داخل ہیں جن سے عمر ضائع ہوتی ہے اور بعض علوم ایسے پڑھائے جاتے ہیں جو نہ دین کے کام کے ہیں اور نہ دنیا کے۔ بہت سے لوگوں کی خواہش ہے کہ کسی طرح علوم و فنون جدید ان کے ہاتھ

آجائیں۔ جابجا مسلمانوں کے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ اور ہر جگہ ان کے قائم کرنے کا چرچا ہے۔ اس پرچہ میں ہم کو عقاید و مسائل مذہبی سے بحث کرنا مقصود اصل نہیں ہے۔ مگر چونکہ مسلمان مذہب اور تمدّن و معاشرت کو متحد سمجھتے ہیں اس لئے ان مسائل مذہبی سے بحث کی گئی ہے جو ہمارے مقصود سے علاقہ رکھتے ہیں جن باتوں کو ہم سچے دل سے مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں اور ترقی تہذیب مسلمانوں کا بھی مانع قوی جانتے ہیں اس کو مٹانا اور دور کرنا چاہتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ بغیر سچا اسلام بے میل اختیار کئے کسی چیز کی بھلائی ممکن نہیں۔ رسومات کو خصوصاً مذہبی رسومات کو مٹانا کچھ آسان کام نہیں۔ تاہم لوگوں کو ہم اس سے متنبہ کرتے رہے ہیں۔ اور ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو مذہب نیچر کے برخلاف ہو وہ سچا نہیں ہے۔ ٹھیٹھ مذہب اسلام جب کہ وہ بدعاتِ محدثہ سے پاک ہو بالکل نیچر کے مطابق ہے اور اسی لئے وہ سچا ہے۔[۱۴]

سرسیّد کی بیان کردہ خدمات کے علاوہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت سے کچھ اور مفید نتائج بھی مترتب ہوئے۔ تہذیب الاخلاق نے مدرسۃ العلوم کی اہمیّت کو بار بار واضح کیا اور مسلمانوں کو انگریزی زبان و ادب اور جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت بتلائی۔ اس کے جواب میں بہت سے مدارسِ اسلامیہ قائم ہوئے جن میں سے متعدد اصلاحی تحریک سے متاثر تھے۔ اسلامی مدارس کے علاوہ اس رسالہ نے کچھ قدامت پسند مولویوں پر بھی اثر ڈالا۔ اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ قدیم علمِ کلام اس زمانے کے مدارسِ اسلامیہ میں پڑھانا بے فائدہ ہے۔ نیز انھوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لیا کہ اسلام پر نئے فلسفے کا ریلا کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ فلسفہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا پر آسمانی مذہب کبھی نہ بدلے گا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کو بڑے مؤثر طریقہ پر ان کے بزرگوں کی علمی اور عقلی فتوحات سے آگاہ کیا تاکہ وہ اپنے موجودہ تنزّل کا مقابلہ زمانۂ سلف کی ترقیات سے کر کے خود ترقی کرنے کی طرف مائل ہوں۔ یورپ کے کئی مصنّفوں نے اسلام اور

اسلامی تاریخ کے متعلق جو غلط بیانیاں کی تھیں ان کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلام پر اعتراض کرنے لگے تھے۔ تہذیب الاخلاق نے ان الزامات کا معقول جواب دینے کا خیال پیدا کیا اور بہت سے مضامین اور کتابیں ایسی لکھی گئیں جن میں مؤثر طور پر غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا۔ مسلمانوں میں تعصب و تنگ نظری کورانہ تقلید، تقدیر پرستی اور فرقہ بندی جیسی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں تہذیب الاخلاق نے ان کو دور کرنے اور روشن خیالی، رواداری، قومی ہمدردی، اسلامی اخوت اور اپنی عزت کا خیال جیسے اوصاف کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اور طرزِ معاشرت میں تہذیب و اخلاق اور شائستگی کا خیال رکھنے کا احساس پیدا کیا۔

تہذیب الاخلاق سرسید کی اصلاحی تحریک اور منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا اور وہ جن مقاصد کے لئے جاری کیا گیا تھا ان میں ناموافق حالات کے باوجود بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ یہ رسالہ جو تہذیب، اخلاق اور شائستگی قوم میں پیدا کرنا چاہتا تھا اس کو خود مضمون نگاروں نے بھی پوری طرح ملحوظ رکھا۔ چنانچہ مخالفوں کے شدید حملوں اور اشتعال انگیزی کے باوجود اس رسالہ نے تہذیب و شائستگی اور متانت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا اور پورے عزم و استقلال کے ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ انگلستان کے اصلاحی جرائد کی طرح تہذیب الاخلاق بھی اس چیز کی ایک روشن مثال ہے کہ دینی عقاید، اخلاق و عادات اور تہذیب و معاشرت جیسے امور کی اصلاح میں جو نہایت دشوار کام ہے ایک جریدہ سے بھی کس طرح اور کس قدر مفید کام لیا جا سکتا ہے۔

حوالے:۔

۱۔ تہذیب الاخلاق۔ جلد پنجم۔ شمارہ شوال ۱۲۹۱ھ

۲۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ ص ۲۲

[illegible] جلد چہارم۔ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ

[illegible] جلد اوّل۔ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ

[illegible] جاوید۔ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۲۱۸

[illegible] سرسید۔ مرتبہ سید راس مسعود۔ صفحہ ۷۳

۷۔ مقالاتِ سرسید۔ مرتبہ عبداللہ خاں خویشگی۔ صفحہ ۳۷

۸۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد اوّل۔ شوال ۱۲۸۷ھ

۹۔ سرسید کے مضامین۔ تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۵۰

۱۰۔ مقالاتِ سرسید۔ صفحہ ۱۴

۱۱۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۲۲۰

۱۲۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد چہارم۔ شمارہ ربیع الاول ۱۲۹۰ھ۔

تیسرا باب

تعلیم کی اصلاح اور ترقی

معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے سرسید نے جو منصوبے بنائے اور جو تحریک شروع کی اس میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں جو مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان سب کا نہایت اہم سبب یہ تھا کہ قوم کی بہت بڑی اکثریت بالکل جاہل تھی اور جو لوگ تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم و تربیت اس قدر ناقص اور غلط طریقہ پر ہوئی تھی کہ نہ تو وہ معاشرہ کے لیے مفید بن سکتے تھے اور نہ خود اپنی حالت درست کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بلکہ ناقص تعلیم اور بگڑی ہوئی ذہنیت کی وجہ سے یہ لوگ معاشرہ کے حق میں جہلا سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوئے تھے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر [illegible] لوگوں پر مشتمل تھا اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی تمام کوششوں میں یہ لوگ سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے تھے۔ سرسید جو اصلاحات [illegible] کامیابی کے لئے یہ بات لازمی تھی کہ تعلیم میں اصلاح کر [illegible] تعلیم کو بدلا جائے۔ جدید طرز کے تعلیمی ادارے [illegible] مفید علوم سکھائے جائیں۔ اور اچھی تعلیم کے [illegible] پوری توجہ دی جائے تاکہ تعلیم یافتہ طبقہ [illegible] اور ایک ایسے ترقی [illegible] کے تقاضوں [illegible]

[illegible] اور ضرورت کے پیش نظر سرسید نے
[illegible] تربیت پر بہت زیادہ توجہ کی۔ اور قومی تعلیم کے
[illegible] کی باخبری۔ تعلیم انسان میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دیتی
[illegible] صلاحیتوں کو کس قدر نکھارتی ہے اس کو واضح کرنے کے
لیے سرسید نے یہ بتلایا کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے چکنے سنگ مرمر کی چٹان
کی مانند ہے جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس کو خراش تراش کر
[illegible] نہیں بناتا اور اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا اس وقت تک
اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوش نمائیں اور دلربا رنگتیں اور
خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا
دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک
ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر
اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی
و ابدال، نیک و عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے
ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وحشی
قوموں میں بھی اچھی باتیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی وحشیانہ نیکیاں نہایت ناشائستہ
اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے
[illegible] کی جائے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں۔ اور کیسے کیسے
[illegible] شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں
[illegible] کی خوبیوں پر کس طرح پانی پھیر دیا ہے اور ان کی خوبیاں نکھارنے
[illegible] اس کا اظہار کرنے کے لیے سرسید نے کہا کہ میں اپنی
[illegible] دیکھتا ہوں پر ناشائستہ۔ ان میں نہایت دلیری
[illegible] نہایت قومی استقلال دیکھتا ہوں پر
[illegible] غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل

جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان [illegible]
ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی [illegible]

تربیت کی اہمیت

انسان کو مہذب اور [illegible] کے لیے تربیت
بڑی اہمیت ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کے [illegible]
جوہر کھلتے ہیں۔ لیکن صحیح اصول پر تعلیم دینے اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لئے
سر سید نے تربیت کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جتنی کہ تعلیم کو اور وہ تربیت کے بغیر
تعلیم کو ناقص سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اچھی تعلیم صرف چند
کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دے دینے اور انگریزی
بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لیے سب سے بڑی تعلیم دینے والی چیز
سوسائٹی ہے۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ انگلستان میں بچوں اور طالب
علموں کو کتاب پڑھنے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے
ہوتی ہے۔ تربیت تعلیم کا بہت بڑا رکن ہے۔

جب تک تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خیال نہ ہو اس بات کا امکان نہیں کہ
ایک لڑکا انسان بن سکے گا۔ ایسا لڑکا جو چند گھنٹے ماسٹر کے سامنے پڑھ کر آتا ہے
تمام دن خراب صحبت میں بسر کرتا ہے۔ اور اس کو بازاری لونڈوں اور خدمت
گاروں کے لڑکوں کی صحبت نصیب رہتی ہے۔ وہ وہی خراب اور بداخلاق جو
ان بازاری لڑکوں کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور وہی گندی عادتیں جو ان لڑکوں
میں ہوتی ہیں سیکھ لیتا ہے۔ انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے بچے [illegible]
بچوں سے علم کی میزان میں کم ہوں مگر جو تربیت اور [illegible]
وہ ہمارے بچوں میں نہیں ہوتی۔ جن لوگوں نے [illegible]
کو آکسفورڈ اور کیمبرج میں دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں [illegible]
ہے اور تربیت انسان کا زیور ہے اور [illegible]
ہوں اولاد میں انسانیت [illegible]

[illegible] مثال ہے۔ کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت
[illegible] کر اس کے لئے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا
[illegible] ہو تربیت یافتہ موجود نہ ہو۔ ایک یا چند آدمی اپنے خیال
[illegible] کو اپنی اندرونی نیکی کو، اپنے ذہن کی جودت کو، اپنے خیال کی وسعت
[illegible] کو اپنی ہمت کو ترقی نہیں دے سکتے جب تک کہ اسی قسم کے لوگ
اس کے میل جول کے لیے نہ ہوں تاکہ باہمی میل جول سے اور سمجھدار خیالات کے
تبادلے سے تمام چیزیں ترقی پائیں۔ لندن کے لوگ تھوڑی سی تعلیم سے بہت
زیادہ تربیت پا جاتے ہیں۔ اور ہندوستان کے لوگ جو زمانۂ دراز علم سیکھنے میں
صرف کرتے ہیں اور کچھ تربیت نہیں پاتے اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں قومی
تربیت ہے۔ ہر فرد قوم کا صرف اپنی تربیت یافتہ قوم کے میل جول سے ان کے
خیالات سے ان میں رہنے سے کچھ نہ کچھ تربیت پا جاتا ہے۔ پس ہماری قوم اگر قومی تعلیم و
تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوگی تو خود اپنی اولاد کی تربیت کو برباد کرے گی۔

تعلیم اور تربیت کا فرق

ہندوستان میں تعلیم سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے تربیت کی اہمیت کو اس لئے محسوس نہ کیا جاتا تھا کہ یہاں تعلیم کا مفہوم مختلف تھا اور لوگ اس چیز سے ناواقف تھے کہ تعلیم و تربیت میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کو بہتر طریقہ پر حاصل کرنا تہذیب و معاشرت کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ سرسید نے تعلیم و تربیت کا فرق ظاہر کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ یہ دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ کہ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے۔ اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کا تربیت کرنا ہے۔ جو قوتیں کہ [illegible] انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا [illegible] تعلیم ہے۔ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔ [illegible] کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف

اندرونی قوٰی کو حرکت میں لانے اور [illegible]
کو تربیت کرنا اس کے لیے سامان کا مہیا کرنا اور [illegible]
بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا جس طرح [illegible]
ضروری نہیں۔ اسی طرح تربیت پانے سے تعلیم کا پانا بھی [illegible]
و ترقی اور شائستگی کے لیے ان دونوں کا پانا ضروری ہے۔

تربیت کا زمانہ انسان کی تربیت کے لیے سب سے زیادہ موزوں لڑکپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے میں ہر قسم کی تربیت کو قبول کرنے کی استعداد قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس عمر میں اچھی یا بُری جیسی تربیت ہوتی ہے اس کا اثر زندگی بھر قایم رہتا ہے۔ اس لیے سرسید نے تربیت اطفال پر بہت زور دیا۔ اور یہ بتلایا کہ انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو کارخانۂ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں تھوڑا بہت دخل رکھتا ہے۔ انسان ہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے جو دنیا کی آیندہ ترقی کو روک سکتا یا ترقی کر سکتا ہے یا اس کو ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔ انسان کی اس قوت کا اظہار اس تربیت سے ہوتا ہے جو وہ بچوں کو دیتا ہے۔ بچوں پر تعلیم و تربیت بہت اثر کرتی ہے۔ یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے ان میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ لڑکپن [illegible]
جس میں آیندہ کی بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش [illegible]
و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت [illegible]
جلد قبول کر لیتا ہے۔ اگر اس زمانہ میں اچھی تربیت [illegible]
میں مضبوطی آجاتی ہے۔ اور اس کا بدلنا نہایت [illegible]

جو لوگ کہ قومی تربیت یا قومی [illegible]
یہی ہے کہ تربیت اطفال کے لیے [illegible]

[illegible] میں اطفال کی تربیت کا کوئی عمدہ ذریعہ
[illegible] اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے
[illegible] رہے۔ اور اپنے ہمسر خاندان کی صحبت اُٹھائے۔ اور
[illegible] اور جھک کر سلام کرنا یا عین کو ٹھیک اس کے مخرج سے نکال کر
[illegible] کہنا اور ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جائے تو نہایت سعادتمند
اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے۔ اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی
آتا ہو اور کسی میاں جی اور ملاجی سے پڑھتا بھی ہو تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہنچا
ہوا سمجھا جاتا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مفید تربیت کے لیے اور
بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل
جانوروں کے خیالات کے محدود ہو جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ان میں
نہیں رہتا۔ ان کی حرکاتِ مودبانہ صرف بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں۔ تربیت
کامل کے لیے جیسا کہ علومِ مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے ویسا ہی لڑکے کی زندگی کا
ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضروری ہے جس سے روز بروز اس کے
خیالات کو وسعت ہوتی جائے۔ اس کی امنگ بڑھتی جائے۔ اور اس کے قویٰ
نشو و نما پاتے رہیں۔

تربیت کا صحیح طریقہ

مسلمان لڑکوں کو صحیح تربیت دینے کے بارے میں
سرسید کا یہ خیال تھا کہ ان کی عمر دس برس تک نہ
[illegible] گھر سے جدا رکھے جائیں اور ان کی خاص طور پر اور خاص
[illegible] جس کی آب و ہوا عمدہ ہو پُر فضا جگہ پر مکانات
[illegible] باغ لگایا جائے۔ عمارتوں کے ساتھ مسجد بھی بنائی
[illegible] بنایا جائے۔ ایک بڑا کمرہ کھانا کھانے کے لیے
[illegible] مکان کے اندر کھیلے جاتے ہیں۔ اور
[illegible] کسی لڑکے کے ساتھ

کوئی خدمت گار نہ ہو بلکہ ان مکانات کے متعلق [illegible]
کیا کریں۔ لڑکوں کے لئے ضروری ہو کہ مسجد میں باجماعت نماز [illegible]
نماز کے بعد تجویز کردہ طریقہ کے مطابق قرآن مجید پڑھا کریں۔ سب کو ایک قسم کا
یکساں لباس پہنایا جائے۔ اور سب مل کر وقتِ معینہ پر کھانا کھادیں۔ پڑھنے
کھیلنے اور ورزش جسمانی کے اوقات مقرر ہوں اور ہر ایک کے لیے ان کی پابندی
لازمی ہو۔ ان مکانات پر نہایت لائق اور معتمد شخص بطور اتالیق کے مقرر ہو۔
وہ تمام نگرانی اور سب طرح کا بندوبست کرتا رہے۔ اور لڑکوں کی صحت و
تندرستی کا نگران رہے۔ اور اس بات کی بھی نگرانی کرے کہ تمام لڑکے اوقات
مقررہ میں وہی کام کریں جو اس وقت کے لئے معین ہو۔ لڑکوں کے آرام اور
ان کے اپنے گھر جانے اور عزیز و اقارب یا لڑکوں سے ملنے ملانے کے قواعد
مقرر ہوں۔ اور ہمیشہ ان قواعد کی پابندی کی جائے۔ لڑکوں کا علاج کرنے کے لیے
بھی ایک طبیب ملازم رہے۔ یہ مکانات عالی شان بنائے جائیں اور جو
ماہانہ اخراجات ہوں وہ داخل ہونے والے لڑکوں کے مربیوں سے لئے جائیں۔ جبتک
کہ لڑکے گھروں سے علاحدہ ہو کر اس طرح پر تربیت نہ پائیں گے وہ خراب اور بُری
عادتوں کے عادی رہیں گے۔ تربیت گاہ کے اس خاکے کا اہم حصہ یہ بھی ہے کہ
اس سے متصل مدرسہ ہو جس میں نئے اور مفید علوم و فنون کی تعلیم دی جائے اور
صحیح طور سے دینی تعلیم دینے کا بھی معقول انتظام ہو۔ تعلیم و تربیت کے لیے
ادارہ کا یہ وہ نقشہ ہے جو سرسیّد نے انگلستان کے تعلیمی اداروں [illegible]
مرتب کیا تھا اور اسی کے مطابق انھوں نے مدرسۃ العلوم [illegible]

انگریزی حکومت نے ہندوستان میں بھی جدید تعلیم [illegible]
انتظام کیا تھا اور ہندو اس سے فائدہ اٹھا کر [illegible]
حالت کو بہتر بنا رہے تھے۔ لیکن اس [illegible]
بڑا نقص تربیت کا فقدان تھا [illegible]

[illegible] تعلیم دی جاتی ہے اس کے نقائص دور کئے جائیں۔ تاکہ ہندوستانی [illegible] خصوصیات سے مستفید ہو سکے۔ جو یورپی تعلیم کی بدولت پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان میں دی جانے والی تعلیم کے نقائص ظاہر کرتے ہوئے سرسیّد نے یہ بتلایا کہ یہاں جو اعلیٰ تعلیم کہلائی جاتی ہے وہ درحقیقت اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ادنیٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجے کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی دو یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔ یونیورسٹیوں کے ماتحت کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ مگر اعلیٰ اور اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور معاشرتی حالت کی درستی کی ہے جو ابھی تک نہیں ہوئی۔

تعلیم اور عملی زندگی

انسان کی تعلیم و تربیت کا ایک بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کامیاب رہے۔ اور اس کے لیے سرسیّد کے خیال میں یہ بہت ضروری ہے کہ انسان اس بات کا فیصلہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ جب انسان بچپن کی حالت میں ہوتا ہے اور اس امرِ عظیم کا خود فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو اس کے مربیوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود اس کے لیے اس بات کا فیصلہ کریں۔ اور جب وہ انسان خود اس امر کے فیصلے کے لائق ہو تو [illegible] ہوگا کہ خواہ اس فیصلے کو بحال رکھے اور چاہے منسوخ کر کے خود اس کا فیصلہ [illegible] میں ایک عام رواج ہے کہ جب بچّہ تعلیم پانے کی عمر کو پہنچتا ہے تو [illegible] کرتے ہیں اور اس فیصلے کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کا

بندوبست کرتے ہیں۔ ایک طالب علم جو ابتدائی تعلیم شروع کرتا ہے [illegible]
فیصلہ نہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا اسوقت تک اسکو تعلیم میں کامیابی نہیں
ہوتی۔ بہت سے طالب علموں کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قسم کی تعلیم شروع کرتے ہیں اور پھر
اس سے گھبرا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے اس
بات کا کہ وہ کیا ہوں گے اور کیا کریں گے بخوبی فیصلہ نہ کیا اور اسی سبب ان میں عزم جزم
پیدا نہیں ہوا جو تمام مشکلات کا آسان کرنے والا اور ہر ایک موانع پر غالب آنے والا ہے۔

زمانۂ طالب علمی کے بعد انسان کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جس میں اس
امر کا تصفیہ زیادہ تر عظیم الشان ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی ضروری تعلیم و تربیت سے
فارغ ہوتا ہے اور ایک قسم کی تمیز اور سمجھ حاصل کرتا ہے تب اس کو خود اپنے آپ سے
پوچھنا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ اور اس وقت اگر وہ اس کے تصفیہ پر
قادر نہیں ہوتا تو ہمیشہ خراب و خستہ رہتا ہے۔ اور اگر بخوبی تصفیہ کر لیتا ہے اور تصفیے میں
غلطی بھی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور وہ اس میں ضرور کامیابی حاصل
کرتا ہے۔ چنانچہ سرسید نے زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح تعلیم و تربیت حاصل کرنے
کے لیے یہ بہت ضروری قرار دیا کہ انسان یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کیا بننا اور کیا کرنا ہے۔
یہ فیصلہ کرنے میں حقائق کو ملحوظ رکھا جائے تاکہ فیصلہ غلط نہ ہو اور اس فیصلے کے مطابق
پورے عزم کے ساتھ جد و جہد کی جائے تاکہ حصول مقصد میں کامیابی ہو۔ کیونکہ
کامیابی کی جڑ اس امر کا صحیح فیصلہ کر لینا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔

مذہبی تعلیم کی ضرورت

یورپ میں جدید تعلیم کے حامیوں کا ایک گروہ ایسا تھا
جو مذہبی تعلیم کو عام تعلیم سے خارج کر دینا چاہتا تھا کیونکہ
وہ لوگ اس تعلیم کو باہمی اختلاف کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اور [illegible]
دینا چاہتے تھے جو بلا اختلاف سچ اور فائدہ مند ہو۔ [illegible]
مذہبی تعلیم کو اصل مقصد قرار دے کر عام تعلیم [illegible]
پہلے گروہ سے اختلاف تھا۔ اس لیے کہ [illegible]

[illegible] کوشش مقصود ہے ایک ایسا امر ہے جس کے ہونے کی [illegible] نہیں ہے۔ اس لئے اس گروہ کو کامیابی نہیں ہوئی لیکن دوسرے [illegible] نے نہایت کامیابی حاصل کی۔ اور اس کے سبب سے بے انتہا علوم و فنون نے ترقی پائی۔ اور ان لوگوں نے نہ صرف اپنی قوم اور ملک کو فائدہ پہنچایا بلکہ دور دور کی قوموں اور دور دور کے ملکوں کو بھی ہر قسم کی خوبیوں اور فائدوں سے اپنا احسان مند بنایا۔ اور آیندہ نسلوں کی تعلیم کے لیے کروڑوں روپیہ جمع کر جانے، اور کتب خانوں اور مدرسوں اور کالجوں کے بنانے اور یونیورسٹیوں کے قایم کر جانے سے تمام علوم و فنون کا دروازہ کھولا۔ اس طریقے کی کوششوں میں جو نقصان تھا وہ صرف یہ کہ بد تعصباتِ مذہبی کی ترقی کا اندیشہ تھا۔ مگر اچھی تعلیم نے خود اس نقص کو مٹا دیا۔ بلکہ ضرورتِ تمدن و معاشرت کے سبب سے تعصبات بہت گھٹ گئے اور بہت سی متعصبانہ رسمیں موقوف ہو گئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے سرسید کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ ان کو جدید علوم و فنون کی مفید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے۔ لیکن مذہبی تعلیم سے ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ دو چار ملاں کسی جگہ پڑھانے کو مقرر کر دیے جائیں اور وہی پرانی کڑھائی کتابیں دو چار دس پانچ آدمیوں کو پڑھانے لگیں۔ بلکہ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اوّل فہمیدہ فہمیدہ، ذی علم اور ذی عقل لوگ جمع ہوں اور بعد بحث و گفتگو کے یہ بات قرار دیں کہ اب سلسلۂ تعلیم بہ نظر حالاتِ زمانہ اور بہ لحاظ علوم و فنون جدید کے کس طرح پر قایم ہونا چاہیے اور ہماری پرانی اور دقیانوسی تعلیم کے سلسلہ میں کیا کیا تبدیلی اور ترمیم کرنی چاہیے اور ہمارا سلسلہ تعلیم کا بہ لحاظ مقاصد مذہبی کس طرح پر قائم ہو۔"

ہندوستان میں لوگ مذہبی تعلیم کے تو بڑے حامی تھے لیکن یہ چاہتے تھے کہ [illegible] بندوبست بھی حکومت کرے۔ سرسید کا یہ خیال تھا کہ تعلیم کا [illegible] اور خود کچھ نہ کرنا بڑی بے حسی اور بے غیرتی کی بات

ہے۔ اور ایسے ملک میں جہاں پچیس کروڑ آدمی بستے ہوں حکومت نہ پوری [illegible]
کو تعلیم دے سکتی ہے اور نہ وہ ایسی پوری تعلیم کا انتظام کر سکتی ہے جس سے ہمارے
پورے اغراض حاصل ہو سکیں۔ سرسید کی یہ رائے تھی کہ اہلِ ہند اپنی مذہبی تعلیم کا
انتظام خود کریں۔ چنانچہ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا
تھا کہ گورنمنٹ ہر فرقہ کی مذہبی تعلیم کے قصے میں نہیں پڑ سکتی۔ وہ عام تعلیم کی پالیسی
اختیار کرے گی۔ مسلمان مذہبی تعلیم دینا لازمی تصور کرتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ
خود مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ جب تک تمہارے جسم میں جان ہے تم مذہبی تعلیم کو ہرگز
نہ چھوڑو۔ گورنمنٹ ہماری مدد کر سکتی ہے۔ لیکن ہماری یہ غرض خود متوجہ ہوئے بغیر
پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیں ہم ان کو دونوں
طرح کی تعلیم نہیں دلا سکتے۔[1]

پرانے علوم کی حالت

مسلمانوں کی تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ صرف پرانے علوم تک محدود تھی اور جدید علوم و فنون کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ مروجہ علوم اس قدر پرانے تھے کہ صدیوں سے غیر مفید ہو گئے تھے۔ اور ان کو ایجاد کرنے والے نئے علوم سے جو موجودہ زمانے کے لیے نہایت ضروری اور مفید ہیں واقف تک نہ تھے۔ مسلمانوں نے پرانے علوم جس زمانے میں اختیار کئے تھے اس وقت کے لیے وہ یقیناً مفید تھے اور ان سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپ کی قوموں کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ان علوم میں چونکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے یہ رفتہ رفتہ ناقص اور غیر مفید ہو گئے۔ لیکن مسلمان بدستور انہی علوم کو حاصل کرتے رہے اور ان کو اپنے اسلاف کا بڑا کارنامہ سمجھ کر ان سے سرمو انحراف کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ سرسید نے مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ موجودہ زمانے کے لیے پرانے علوم کافی نہیں [illegible] نئے علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی [illegible] ہمارے باپ دادا اپنے حاصل کئے [illegible]

[illegible] لوگوں کے نام عزت سے لیے جائیں گے۔ مگر اس زمانے میں [illegible] دیکھنے کے ہے کہ کون سی چیز اب ہم کو اور ہمارے ملک کو مفید ہے۔ جس زمانے میں مشرقی علوم ہمارے باپ دادا نے حاصل کئے تھے اس کو ہزاروں برس ہو گئے۔ جو علوم سابق میں جاری اور ایجاد ہوئے تھے ان میں بعض علوم تو بلاشبہ اب تک سچے ثابت ہوئے ہیں مگر ان میں بھی بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ اور بہت سے علوم اب ایسے ایجاد ہوئے ہیں جن کو ہمارے تمہارے باپ دادا نہ جانتے تھے اور وہ اس زمانے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر ہم اس پرانی لکیر کو پیٹتے رہیں تو گویا ہم موجودہ زمانے سے سیکڑوں برس پیچھے ہٹتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو آگے بڑھنا چاہیے۔[۱۲]

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں کئی صدیوں تک علوم و فنون کی ترقی میں بہت اہم اور نمایاں حصّہ لیا اور دنیا کی مختلف قوموں نے ان کے تعلیمی اداروں سے فائدہ اُٹھایا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ علم کو مسلسل ترقی دے رہے تھے اور اس بنا پر دنیا کی دوسری تمام قوموں سے زیادہ ممتاز تھے لیکن جب ان کی علمی ترقیوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ پُرانی لکیر کے فقیر بن گئے اور علمی دُنیا میں ان کی حالت بہت پست ہو گئی۔ اب اس پستی سے نکلنے کی صورت صرف یہی ہے کہ مسلمان جدید علوم کو حاصل کریں۔ اور دنیا کی علمی ترقی میں حصّہ لینے کے قابل بنیں۔ مسلمانوں نے علمی ترقی کے مختلف مدارج کیوں کر طے کئے اور علوم کی نوعیت کس طرح تبدیل ہوئی اس کو واضح کرنے کے لئے سرسیّد نے یہ بتلایا کہ مسلمانوں میں ترقی علوم کا آغاز قرآن کو اوّل سے آخر تک یکجا جمع کر کے بطور ایک کتاب کے لکھنے سے ہوا۔ دوسری منزل ترقی علوم کی یہ تھی کہ لوگ حدیثوں کو جمع کرنے اور حدیثوں کی کتابیں لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ اس کے بعد علمِ کلام میں کتابیں تصنیف ہونی شروع [illegible] کی ترقی سے مسلمانوں میں علوم کو ترقی ہوئی۔ خلفائے عباسیہ کے [illegible] عربی زبان میں ترجمے ہوئے اور یہ مسلمانوں میں رائج ہو گئے

جس سے علوم کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ [illegible]
کی ترقی کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ جس طرح [illegible]
مسلمانوں نے حاصل کی تھی اب ہم فلسفہ و حکمت جدیدہ کے حاصل کرنے میں [illegible]
کریں۔ کیونکہ علوم یونانیہ کی غلطی اب علانیہ ظاہر ہوگئی ہے اور علوم جدیدہ نہایت
عمدہ اور مستحکم بنیاد پر قائم ہوئے ہیں۔[۱۲]

ایک زمانے میں مسلمانوں نے علوم اور فنون میں ایسی ترقی کی تھی اور ایسی
فیاضی سے اپنے علوم سے یورپ کی قوموں کو نفع پہنچایا کہ بڑے بڑے مصنفوں نے اس
بات کا اقرار کر لیا ہے کہ اگر مسلمان ان علوم میں ایسی ترقی نہ کرتے اور ان سے اور
قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہنچتا جیسا پہنچا تو آج دنیا میں ان علوم و فنون کا نام بھی نہ
ہوتا۔ قرطبہ کی یونیورسٹی نے اور بغداد کی یونیورسٹی نے اپنے علوم و فنون کی ترقی کی
وجہ سے تمام دنیا میں علم کا آفتاب روشن کر دیا۔[۱۳] مسلمانوں کی علمی ترقی کے اس زمانہ
میں ان کی تعلیم بھی عمدہ تھی۔ اور ان میں سب خوبیاں بھی موجود تھیں لیکن جب ان میں
علوم کی ترقی بند ہوگئی تو ان کی تعلیم بھی ناقص ہوگئی اور ان کی تمام خوبیاں بھی
جاتی رہیں۔ علمی اور معاشری پستی کی اس حالت سے نکلنے کے لیے سرسید اس بات
کو لازمی سمجھتے تھے کہ مسلمان جدید اور مفید علوم و فنون کو حاصل کریں اور علمی ترقی
کے اس راستے پر پھر چلنے لگیں جو انھوں نے صدیوں سے ترک کر دیا ہے۔

انگریزی کی تعلیم سرسید کے زمانے میں نہ صرف تعلیمی ترقی بلکہ سیاسی،
معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بھی انگریزی کی تعلیم
حاصل کرنے کی بڑی ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے اس ضرورت کو محسوس کر لیا
تھا۔ اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے [illegible]
انگریزی سے متنفر تھے اور ان کی یہ نفرت بھی ان کی ترقی کے [illegible]
رکاوٹ بن گئی تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان [illegible]
اس کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ کریں اور [illegible]

[illegible] استدلال پیش کیا کہ جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے [illegible] اسی کی زبان اختیار کی جاتی ہے۔ اور جس ملک میں جو زبان حکومت کی ہوتی ہے اس ملک میں اسی زبان کا عروج ہوتا ہے اور لوگ اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ خلفائے بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا اور ہر شخص اس زبان کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا عروج تھا اور اسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ اور جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا۔ اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اور اب ہندوستان میں انگریز کی حکومت ہے جس کی زبان انگریزی ہے۔ اور اسی زبان کو عروج ہے۔ اس لیے ہر شخص اس زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کوتاہی کی ہے جو بڑی غلطی ہے۔[1]

انگریزی زبان سے مسلمانوں کی نفرت کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کا بڑا طبقہ انگریزی پڑھنے کو اسلام کے خلاف سمجھتا تھا۔ سرسید نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے بزرگ انگریزی خواں لوگوں کو بدعقیدہ یا ملحد و دہریہ کہتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی ہو جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو ایک حرف انگریزی کا نہیں جانتے مگر بدعقیدہ ہیں۔ بعض علماء مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے والوں کو آگے جانے دو۔ اگر تم دینی، تمدنی، [illegible] چاہتے ہو تو پیچھے ہٹو۔ اور پچھلے لوگوں سے جا ملو۔ اور یہاں تک پیچھے ہٹو، کہ [illegible] صحابہ اور نبی آخر الزماںؐ سے جا ملو۔ پیچھے ہٹنا تو آسان ہے۔ مگر صحابہ اور [illegible] تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ [illegible] گڑھے میں جا پڑو۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ [illegible] علوم مذہبی کے ساتھ علوم دنیوی میں ترقی کی اور دنیا میں [illegible] حکومت حاصل کی وہی زمانہ اسلام کی ترقی اور جاہ و

جلال اور عزت و شوکت کا سمجھا جاتا ہے۔ جو علماء کہتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علومِ جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل ہوتا ہے ان کو یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ یورپ میں جدید تعلیم نے عیسائیت پر جو بُرا اثر ڈالا تھا اس سے سرسید بخوبی واقف تھے۔ لیکن اسلام کو نئے علوم سے ایسا کوئی خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو بھی لازمی تصور کرتے تھے۔

انگریزی زبان میں تعلیم دینے کے بارے میں سرسید کا یہ خیال تھا کہ جن اسکولوں کا مقصد طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا نہیں ہے وہاں مغربی علوم کو دیسی زبان میں پڑھانا ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ لیکن جو اسکول اس لیے قایم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بطور ایک زینہ کے کام دیں وہاں یورپی علوم کو دیسی زبان میں پڑھانا مفید نہیں ہو سکتا ہے ہندوستان میں انگریزی زبان کی حکومت ہے۔ اس لیے اس ملک میں دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ سرسید کا یہی وہ نظریہ تھا جس کی وجہ سے اُنھوں نے اُردو یونیورسٹی قایم کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ اُردو میں اعلیٰ تعلیم دینے اور یونیورسٹی قایم کرنے کے بڑے حامی تھے اور اس کے لیے بہت کوشش کی۔ لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حکومت کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اس کی جگہ اُردو یونیورسٹی قایم کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنی کوششوں سے دست کش ہو گئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ملک انگریزی سے محروم ہو جائیگا اور یہ محرومی اعلیٰ تعلیم اور علمی ترقی کے لیے نقصان رساں ہوگی۔

دیسی زبان میں تعلیم کی اہمیت

سرسید کے زمانے میں ہندوستان کی کوئی زبان اس قابل نہ تھی کہ اس کو یورپی علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکتا۔ اس وقت علمی ترقی کے لیے مقامی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس بات کی ضرورت تھی کہ [illegible] علوم کو ان زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اور اسی ضرورت کے [illegible]

نے سائنٹیفک سوسائٹی قایم کی تھی جس کا مقصد اُردو میں نئے علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کرنا تھا۔ ہندوستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے سرسید انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے رکھنے کے اس قدر حامی تھے ورنہ وہ اس بات کو خوب محسوس کرتے تھے کہ جو قوم خود اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتی ہے وہ بہت تیزی سے ترقی کر جاتی ہے۔ اور انگلستان میں قیام کے زمانے میں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے اس خیال کی پوری طرح تصدیق بھی ہو گئی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں یا گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں۔ اور آیندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہو گی۔ انگلستان کے عوام میں سرسید نے جو علم تعلیم، تہذیب و شائستگی اور عمدہ تربیت دیکھی اس سے وہ بے انتہا متاثر ہوئے۔ اور اس کے اسباب واضح کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ بیان کیا کہ گو انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسی ہندوستان میں، علی الخصوص شمال و مغربی اضلاع اور صوبۂ بہار میں اُردو جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ اور انگلستان میں تمام ترقی کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے قوم کی اسی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنےٰ [illegible] کی زبان میں ان کو دیئے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے

ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آیندہ زمانے کی یادگاری کے لئے کھود دی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔[۱۲]

مسلمانوں کیلئے تعلیم کیسی ہو

مسلمانوں کو کس طریقہ پر تعلیم دی جائے یہ اس وقت بہت اہم اور غور طلب مسئلہ تھا اور اس پر مختلف رائیں تھیں۔ چنانچہ ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ غور و فکر اور باہمی مباحثہ کے بعد یہ رپورٹ تیار کرے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کونسا طریقہ اچھا ہوگا۔ اور موجودہ حالات میں اس مقصد کے لئے کون سی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس کمیٹی کے ممبروں کے سامنے سرسید نے جو بیان دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے کس طریقۂ تعلیم کو مفید اور اچھا سمجھتے تھے اور ان کی تعلیم میں مختلف طبقوں کے کن کن مقاصد کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔ اس ضمن میں سرسید نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ تعلیم ہمیشہ کسی ایک خاص مقصد کے لیے نہیں ہوتی اور نہ کسی ایک گروہِ کثیر کا ہمیشہ ایک ہی مقصود ہوتا ہے۔ بلکہ ایک گروہِ کثیر میں سے مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ ہم جس طریقۂ تعلیم کے قرار دینے کی فکر میں ہیں وہ ایک بہت بڑے گروہ سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور یقینی مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد تعلیم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ایسا طریقۂ تعلیم تجویز کرنا چاہیے جو مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد کو پورا کرنے کو کافی ہو۔ ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے اور انتظام گورنمنٹ میں شامل ہو کر دنیاوی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو گورنمنٹ کے عہدوں کے حاصل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قوتِ بازو سے بذریعہ تجارت یا اجرائے کارخانہ جات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ صرف اپنی جائداد اور اپنے علاقہ جات کی درستی کی آرزو [illegible]

جماعت ایسی ہے کہ علوم و فنون کو حاصل کرنا اور ان میں واقفیتِ کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ وہ بہ لحاظ اپنے مفاد کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جن کے لیے کسی قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ بایں ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اس کے عقائد مذہبی بھی درست رہیں۔ اور وہ ادائے فرائضِ مذہبی سے غافل نہ ہو جائے۔ پس جب کہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہیے جس سے تمام مقاصدِ مذکورہ اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ مسلمان اپنے تعلیمی مقاصد اسی وقت حاصل کر سکیں گے جب وہ حکومت پر انحصار کرنے کے بجائے خود اس کے لیے کوشش کریں گے اور اپنے مقاصد کے حصول تک حکومت سے اتنی ہی امداد لیں گے جو ان کی مساعی کی کامیابی کے لیے خود حکومت کے قواعد کے مطابق حاصل کرنے کے وہ مستحق ہوں گے۔ کسی قوم کو یہ سب مقاصد جب تک کہ وہ خود ان مقاصد کے حاصل کرنے پر مستعد نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتے پس ہم کو اپنے تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر نہ رکھنا چاہیے۔ بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ان تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔ پس ہم کو دو قسم کی تجویزیں کرنی چاہئیں ایک تو کامل اور پوری ہادنی سے اعلیٰ درجہ تک تعلیم کی جو ہمارے تمام مقاصد کو پوری کر سکیں اور جن میں ہم کو گورنمنٹ سے اس کی تعمیل کرانے کی کچھ خواہش نہ ہو بلکہ خود اپنی سعی و کوشش سے اس کا انجام کرنا مدِ نظر ہو۔ اور دوسری تجویز اس بات کی کرنی چاہیے کہ جب تک ہم اس اوّل تجویز کو انجام دیں یا اس کو انجام دینے کے لائق ہوں اس وقت تک ان اصول و قواعد سے جو گورنمنٹ نے تعلیم

کے لیے مقرر کیے ہیں کیونکر فائدہ اُٹھائیں اور ہمارے متعدد مقصدوں میں سے جو مقصد حاصل ہو سکتے ہیں وہ کیوں کر حاصل کریں۔[۱] لوگ خود ہی اپنی تعلیم کا اہتمام کریں۔ اس خیال پر سرسید سختی سے قائم تھے۔ اور ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ "اگرچہ میرا یہ خیال لوگوں کی عام رائے سے مختلف ہے مگر میں نے پورے غور و فکر کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جب تک لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا انتظام ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور ملک کے لیے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام تر اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے۔ اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے۔[۲]"

جدید علوم کی ضرورت

نصاب تعلیم میں تبدیلی بھی ایک اہم مسئلہ تھا اور اس کی ضرورت واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ کہا کہ "جب مسلمانوں میں کچھ تعلیم کی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اس بات پر مقصود ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درسِ کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں اور ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔ زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرزِ بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتیں۔ بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا، جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا سکھاتی ہیں۔ اور اس لیے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو ان سے کچھ فائدہ ہو مضرت حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اور یہی کس قدر بڑی مضرت ہے کہ ان کو پڑھ کر عمر بے فائدہ چیز میں ضائع کی جاتی ہے۔[۳]" اپنے اس خیال کو سرسید نے زیادہ واضح طور پر گورکھپور میں تقریر کرتے ہوئے یوں ظاہر کیا

کہ دنیاوی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے کچھ دنیا کا کام چلے پس ضرور ہوا کہ ہم وہ دنیاوی علوم اپنی تعلیم میں داخل کریں جو درحقیقت دُنیا کے کام کے ہیں۔ اگر ہم صرف یہی مقصد رکھیں کہ وہی پرانا فلسفۂ ہیئت اور منطق پڑھا دیں اور ان علموں سے کچھ سروکار نہ رکھیں جو آج ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں تو ہم درحقیقت اپنی قوم کے ساتھ کچھ بھلائی نہیں کریں گے۔ جو علوم ہماری قوم میں سات سو برس پہلے تعلیم میں داخل ہوئے تھے اگر آج ہم انھیں علوم پر قناعت کریں تو گویا ہم اپنی قوم کو حال کی ترقی سے سات سو برس پیچھے لے جائیں گے۔ پس ہم کو بڑی مضبوطی سے ارادہ کرنا چاہیے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً الجبرا و یوکلڈ، زوالوجی بیالوجی، لاجک، مارل فلاسفی، کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں بڑے اہتمام سے اور کامل طور سے تعلیم دیں۔ اپنے اس خیال کے مطابق کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود اہتمام کریں اور یورپ کے نئے علوم سے فائدہ اٹھائیں سرسید نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قایم کرنے کا ارادہ کیا اور برطانیہ کے طرزِ تعلیم و تربیت کا غائر مطالعہ کر کے مسلمانوں کے لیے ایک کالج قایم کرنے کا منصوبہ بنایا اور بڑی جد و جہد کے بعد اس منصوبے کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوئے۔

تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے عملی کوششیں

سرسید اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا ایک بہت بڑا اور بنیادی سبب عوام کی جہالت اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ناقص تعلیم و تربیت ہے۔ اور معاشرہ کی حالت درست کرنے کے لیے جن اصلاحات کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک کہ قوم کی تعلیمی حالت کو بہتر نہ بنایا جائے۔ لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے جو حالات تھے ان میں تعلیم کی اصلاح کرنا اور اس کو پھیلانا بڑا

ہی مشکل کام تھا۔ ملک پر ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ پوری قوم کی تعلیم کا انتظام کر سکے گی یا سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی اور مفید مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کرے گی۔ تعلیم کی ترقی میں دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان قوم تقریباً ایک ہزار سال سے ایک ایسے طرزِ تعلیم کی پابند چلی آ رہی تھی جس میں عقلی و نقلی ہر قسم کے علوم کو ایک قسم کی مذہبی نوعیت دے دی گئی تھی اور اس میں تبدیلی کا تصور تک نہ کیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں طرزِ تعلیم اور مروجہ علوم کو بدل کر نئے اور مفید علوم و فنون سکھانے کے لیے مغربی طرز کے تعلیمی ادارے قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سرسید ان مشکلات کو محسوس کرتے تھے لیکن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جب تک ان مشکلات کو دور کر کے تعلیمی حالت درست نہ کی جائے گی مسلمان کسی صورت میں بھی ترقی نہ کر سکیں گے۔

مدارس کا قیام ۱۸۳۵ء میں حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی۔ ہندوؤں نے تو اس سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور نہ صرف تعلیمی بلکہ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی مسلمانوں پر اس کا بُرا اثر پڑا۔ سرسید نے جب یہ حالت دیکھی تو انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا ارادہ کیا چنانچہ ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ قایم کیا۔ اور تعلیم کے بارے میں اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک رسالہ لکھا جس میں سرکاری مدرسوں کی تعلیم اور انتظام میں خرابیوں پر اعتراض کیا اور انگریزی تعلیم دینے کی ضرورت اور اس کے فوائد بیان کیے۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید نے ایک مدرسہ غازی پور میں قایم کیا جس کی [illegible] اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا۔ اور اس کے افتتاح کے [illegible]

کیا کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کر سکے گا جب اس ملک میں بسنے والی قومیں اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر عمل کریں گی اور اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیں گی۔ اس مدرسہ میں انگریزی، اُردو، فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور اس کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اس مدرسہ کو کالج بنا دیں۔ لیکن اسی سال غازی پور سے ان کا تبادلہ ہو گیا اور یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

سائنٹفک سوسائٹی

سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم و فنون سے واقف ہوں اور پرانے مروجہ علوم کے بجائے جو ان کے لیے بالکل بیکار تھے نئے اور مفید علوم حاصل کریں۔ لیکن نئے علوم کی کتابیں انگریزی میں تھیں اور مسلمان انگریزی سے نفرت کرتے تھے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے سرسید نے یہ تدبیر سوچی کہ نئے علوم و فنون کی کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کر کے مسلمانوں میں ان کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان نئے علوم سے واقف ہونے لگیں گے اور دوسرے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انگریزی میں کیسی مفید اور کار آمد کتابیں ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ انگریزی سے ان کی نفرت کم ہونے لگے گی اور وہ اس زبان کو سیکھنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ اپنے اس خیال کے مطابق سرسید نے ۱۸۶۲ء میں ایک تحریر التماس بخدمت ساکنانِ ہند درباب ترقی تعلیم اہلِ ہند" کے عنوان سے شائع کی جس میں ایک ایسی مجلس قایم کرنے کی ضرورت بیان کی جو اپنے قدیم مصنفوں اور انگریزوں کی مفید کتابیں اُردو میں ترجمہ کر کے شایع کرے۔

مجلس کے مقاصد اور اس کی ضرورت سے لوگوں کو بخوبی آگاہ کرنے کے بعد سرسید نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس قایم کی۔ اسی وقت کے وزیرِ ہند سوسائٹی کے سرپرست اور شمال مغربی صوبہ

اور پنجاب کے گورنر نائب سرپرست بنائے گئے۔ اور ہندو اور مسلمان رئیس اس کے ممبر بن گئے۔ سوسائٹی نے مفید کتابوں کے ترجمے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔ اور علمی حلقوں میں اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ ۱۸۶۴ء میں سرسیّد کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا اور سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سوسائٹی نے بڑی ترقی کی۔ اس کے لیے شاندار عمارت بنائی گئی۔ مستقل عملہ رکھا گیا۔ بڑے بڑے عطیے ملنے لگے اور کافی تعداد میں بہت مفید کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے سوسائٹی کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد سہ روزہ ہو گیا۔ اس اخبار سے اصلاحی تحریک کو مقبول بنانے میں بہت کام لیا گیا۔ اور سرسیّد آخر دم تک اس میں مضامین لکھتے رہے۔ اخبار کا ایک کالم اُردو میں ہوتا تھا اور ایک انگریزی میں۔ اور اس میں علمی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی ہر قسم کے مضامین شایع ہوتے تھے۔ اور ان موضوعات پر سوسائٹی میں جو لکچر دیئے جاتے تھے وہ بھی اسی اخبار میں شایع کر دیئے جاتے تھے۔ تاکہ لوگ ان سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ سرسیّد کی اصلاحی تحریک میں اس اخبار کی بڑی اہمیت تھی۔ اور لوگوں کے خیالات بدلنے اور معاشرہ کی خرابیاں دور کرنے کا احساس پیدا کرنے میں اس نے کافی حصّہ لیا۔

اُردو یونیورسٹی کی تحریک

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے کے بعد ہندوستان کا برطانوی پارلیمنٹ سے قریبی تعلق ہو گیا اور سرسید کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ سے رابطہ قایم کرنا چاہیے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قایم کی تھی جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کے مقاصد و مطالب سے حکومت ہند اور پارلیمنٹ کو آگاہ کیا جا سکے۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو اُردو میں اعلیٰ تعلیم

ایک یونیورسٹی قایم کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل ہند سے یہ درخواست کی کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قایم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے۔ اسی زبان میں ان مضامین کا سالانہ امتحان لیا جائے جو کلکتہ یونیورسٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ علم کی مختلف شاخوں میں انگریزی میں تعلیم پانے والے طلباء کو لیاقت کے اعتبار سے جو سندیں دی جاتی ہیں وہی دیسی زبان میں امتحان پاس کرنے والے طلباء کو بھی دی جائیں۔ اور اس مقصد کیلئے یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں اُردو کا الگ شعبہ قائم کر دیا جائے یا شمال مغربی اضلاع میں اُردو کی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اُردو میں کتابوں کا ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہو سکے گا سائنٹیفک سوسائٹی انجام دے گی۔

حکومت نے بھی اس درخواست پر بہت توجہ کی اور گورنر جنرل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ میں جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال بہت مقبول ہوا اور ان میں یہ بحث چھڑ گئی کہ مجوزہ یونیورسٹی لکھنؤ، دہلی اور لاہور میں سے کہاں قائم کی جائے۔ اس دوران میں سرسید کو یہ علم ہوا کہ حکومت کا ارادہ یہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے اور انگریزی کی تعلیم صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے جاری رہے۔ سرسید کو اس خیال سے اتفاق نہ تھا کہ انگریزی کی تعلیم صرف ثانوی زبان کی رہے اور کسی یونیورسٹی میں اس کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے۔ وہ اس چیز کو علمی ترقی اور قومی مفاد کے لیے نقصان رساں سمجھتے تھے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر دینے کے بجائے یہ چاہتے تھے کہ یا تو اس میں اُردو کا الگ شعبہ قائم کیا جائے جو اردو میں تمام علوم کی تعلیم دے سکے یا نئی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں بدستور [illegible] اُردو کے [illegible] نے یہ کہنا شروع کیا کہ

حکومت جو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے اس میں مسلمانوں کے لیے اردو اور
ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مختص کر دی جائے۔ اگرچہ ان لوگوں کی تعداد
بہت تھوڑی تھی اور سمجھدار ہندو بہت بڑی تعداد میں اردو میں تعلیم کے حامی
تھے۔ لیکن کئی مسائل پر اختلاف ہونے کے باعث اردو یونیورسٹی قائم نہ ہو سکی۔

برطانوی طرزِ تعلیم کا مطالعہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے بارے میں سرسید کا جو یہ نظریہ تھا کہ مسلمان جدید علوم کی تعلیم حاصل کریں اور اس کے لیے خود اسکول اور کالج قائم کریں اس کے مطابق انھوں نے ایک نہایت عمدہ اور جدید طرز کا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درس گاہ قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگلستان جا کر وہاں کے طرزِ تعلیم سے پوری واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے درس گاہ کے قیام کا منصوبہ بنائیں چنانچہ انھوں نے انگلستان کا جو سفر کیا اس کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد اس ملک کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا بھی تھا۔ اس غرض سے انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا۔ اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی اور اس کے طرزِ تعلیم سے علاقہ رکھتی تھی پوری طرح غور کیا اور تمام باتوں کو ذہن نشین رکھ کر ایک ایسا منصوبہ بنایا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کے مطابق اور ان کے لیے مفید ہو۔

انگلستان میں سرسید نے معاشرتی اور تعلیمی امور کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے میں کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں۔ اور بقول مولانا حالی سرسید کے تمام منصوبے خود ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے اس لیے [illegible] ہندوستان چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمڈن کالج یا محمڈن [illegible] جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوسائٹی اور [illegible]

[illegible] قائم کرنا یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح [illegible] جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بے کار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔ چنانچہ انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا، کہ اپنی تمام زندگی اس کام کے لیے وقف کر دیں۔ اور اس مقصد کے لیے تمام مدارج جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے انھوں نے وہیں طے کر لیے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرسید محمڈن کالج کے قیام کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور اس کو اپنا ایک مقصدِ حیات بنا لیا۔

کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیمِ مسلمانان

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید کی اصلاحی کوششوں نے ایک پرجوش اور منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اور اپنے مقاصد کی اشاعت کے لیے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس نے غور و فکر کی صلاحیت رکھنے والے مسلمانوں کو کافی متاثر کیا۔ یہ رسالہ کالج کے قیام کی جد و جہد کو آگے بڑھانے میں بھی بہت کارآمد ثابت ہوا۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ تمام امور پر خوب غور کرنے کے بعد کالج کے منصوبے کو قطعی شکل دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں "کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیمِ مسلمانانِ ہندوستان" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علوم قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے۔ کمیٹی کے ذمہ یہ کام بھی کیا گیا کہ جب وہ ان امور کے متعلق معلومات فراہم کرے تو ان کو دور کرنے کی تدبیریں [illegible] اور ان تدبیروں پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ ان مسائل پر تعلیم یافتہ [illegible] کرنے کے لیے اچھے مضمون لکھنے والوں کو انعام دینے کا اعلان کیا [illegible] ہوئے ان کی مدد سے سرسید نے ایک رپورٹ مرتب

کر کے کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ اس رپورٹ میں سرسید نے یہ بتایا تھا کہ
مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تعصب کو مسلمانوں کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔
سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور جن اسباب سے مسلمان ان
مدارس میں نہیں پڑھتے ان میں کچھ ناواجبی اور کچھ واجبی ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی
ضرورتوں کے لیے سرکاری طریقہ تعلیم ناکافی ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنی ضروریات کے
مطابق اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام خود کرنا چاہیے۔ سرسید کی اس رپورٹ
میں مجوزہ کالج کی اسکیم بھی شامل تھی اور طریقۂ تعلیم کی بھی وضاحت کی گئی تھی۔

سرکاری اسکولوں سے تنفر کے اسباب

حکومت نے انگریزی کی تعلیم جاری
کر دی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مسلمان
بھی ان مدارس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔
تعلیم کی اشاعت کے لیے حکومت طرح طرح سے ترغیب دیتی تھی۔ اور حکومت
کے ہاتھ میں مسلمانوں کے کئی بڑے اوقاف بھی تھے جن کی آمدنی تعلیم پر صرف کی
جاتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے ان تعلیمی اوقاف سے بھی ہندو ہی فائدہ اٹھاتے تھے
اور مسلمان کسی طرح بھی سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے پر راضی نہ ہوتے
تھے۔ آخر مسلمان سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ایک اہم
اور غور طلب مسئلہ تھا۔ اور بہت غور و فکر کے بعد اس کے اسباب یہ قرار دیے گئے
تھے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اس لیے
مسلمان ان میں شریک نہیں ہوتے۔ یہ خیال عام ہے کہ انگریزی اداروں میں
تعلیم پانے سے مسلمان طلباء لامذہب ہو جاتے ہیں اس لیے مسلمان اپنے بچوں کو
ان اداروں میں داخل کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان اداروں کے بارے میں یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں پڑھنے سے اخلاق و آداب خراب ہو جاتے ہیں۔
لڑکے گستاخ اور مغرور ہو جاتے ہیں۔ اور بزرگوں کا ادب و احترام ان کے
دل سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ ان اداروں کو [illegible]

[illegible] اسکولوں اور کالجوں کے خلاف لوگوں میں یہ تعصب بھی موجود ہے کہ شریعت کی رُو سے ان میں تعلیم پانا حرام اور ناجائز ہے۔ اور یہ خیال ان اداروں میں مسلمانوں کے داخل ہونے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں شریف اور رذیل طبقہ کے لڑکوں میں جو اختلاط ہوتا ہے اس کو پسند نہیں کیا جاتا اور شریف خاندان کے لوگ اس کے بہت مخالف ہیں۔ لوگوں میں یہ خیال بھی ہے کہ اس تعلیم کا کوئی نتیجہ نہیں اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اچھی نوکری نہیں ملتی۔ اس لیے لوگ اس تعلیم کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ افلاس بھی ہے۔ مسلمان عام طور پر مفلس ہو گئے ہیں اور وہ کالجوں اور اسکولوں کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔[۲۵]

کالج قائم کرنے کا فیصلہ

تمام امور پر غور کرنے کے بعد مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کا ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی اسکیم سرسیّد نے تیار کر لی تھی۔ کمیٹی کی رپورٹ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بھی ارسال کی گئی اور ان کو کالج کے قیام کے فیصلہ سے مطلع کیا گیا۔ گورنر جنرل نے اس پر اپنی مسرّت کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اینگلو اورینٹل کالج قایم کیا جا رہا ہے۔ اور صوبائی حکومتوں نے بھی قواعد کے بموجب امداد دینے کا وعدہ کیا۔ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا نام "خزنۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا۔ اور اس کمیٹی کے سکریٹری سرسیّد بنائے گئے۔ سرسیّد نے اشتہار دے کر مسلمانوں سے پوچھا کہ مجوزہ کالج کہاں قائم کیا جائے۔ زیادہ تعداد نے علی گڑھ کو پسند کیا۔ اور آخر کار اسی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں سیّد [illegible] ہندوستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام اور [illegible] نظر رکھ کر مجوزہ کالج کے لیے ایک اسکیم پیش کی۔ جس کو کمیٹی

خواستگار ترقی تعلیم نے پسند کیا اور اس کی نقلیں مرکزی اور صوبائی [illegible] ارسال کر کے حسب وعدہ امداد کا مطالبہ کیا گیا۔ سرسید نے کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم بڑے زور شور سے شروع کر دی اور اس کے لیے تمام ممکن تدبیریں اختیار کیں۔ سمجھدار مسلمان تو اس سے بہت خوش تھے کہ مسلمانوں کے لیے اعلےٰ درجہ کا کالج قایم کیا جا رہا ہے۔ لیکن قدامت پرست اور کوتاہ نظر عناصر نے شدید مخالفت کا ہنگامہ برپا کر دیا اور سرسیّد اور ان کے رفقا کے خلاف طرح طرح کی غلط باتیں مشہور کر کے ان کے کافر ہونے کا فتوےٰ تک حاصل کر لیا۔ لیکن سرسیّد اپنی دُھن کے پکّے تھے۔ اور اُنھوں نے پورے عزم و استقلال سے اپنا کام جاری رکھا۔

ابتدائی مدرسہ کا قیام

مجوزہ کالج کے لیے ایک جامع اسکیم پیش کرنے کے ساتھ ہی سید محمود نے یہ تحریک بھی کی تھی کہ مجوزہ کالج کے ماتحت مدرسہ بہت جلد قایم کر دیا جائے۔ تاکہ اس کو لوگوں کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ دسمبر ۱۸۷۳ء میں کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم نے یہ تجویز منظور کر لی اور علی گڑھ میں ابتدائی مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس درس گاہ میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور مخالفوں کا یہ پروپگنڈا بالکل غلط ہے کہ مجوزہ کالج میں جو تعلیم دی جائے گی وہ اسلام کے خلاف ہو گی۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کا افتتاح ہوا اور یکم جون سے باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔[۲۶]

کالج کا قیام

ابتدائی مدرسہ قایم ہو جانے کے بعد پوری توجہ کالج کے قیام پر مرتکز ہو گئی۔ سرسیّد پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب سرسیّد نے اپنا تمام وقت اور تمام کوششیں اور صلاحیتیں کالج کے لیے وقف کر دیں۔ [illegible] لٹن وائسرائے ہند نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا۔ [illegible]

[illegible] مدرسۃ العلوم تجویز کیا گیا تھا۔ کالج کی عمارتوں کے بارے میں سرسید کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ تمام عمارتیں بہت خوش نما اور نہایت شاندار ہوں تاکہ لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑے اور آیندہ نسلوں کو اپنا ایک باعظمت ادارہ دیکھ کر اس کو قایم رکھنے اور ترقی دینے کا خیال پیدا ہو۔ چنانچہ سرسید بہت شاندار عمارتیں بنوانے لگے جن میں کالج کی متعدد عمارتوں اور اقامت خانوں کے علاوہ ایک بہت بڑی اور خوبصورت مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا اور ان عمارتوں کے لیے روپیہ فراہم کرنے میں سرسید کو بے انتہا کوشش کرنی پڑی۔ مگر وہ اپنے مقصد میں آخر کامیاب ہوئے۔

یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاسوں کا آغاز ہوا۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ جیسا کہ سرسید کا خیال تھا اس کالج میں تعلیم اور تربیت دونوں پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔ نصاب تعلیم میں جدید اور مفید علوم کو داخل کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم کو بھی پوری اہمیت دی گئی۔ طلباء کی تربیت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی ہر اعتبار سے پوری طرح صحت مند ہوں اور ان میں وہ خرابیاں باقی نہ رہیں جو ہندوستانی معاشرہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ خرابیاں دور کرنے کے علاوہ اس تربیت کا مقصد طلباء میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو معاشرہ کی بہتری اور ملک و ملت کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ سرسید کی اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کالج کے طلباء نے تعلیم کی خوبی، تہذیب و شائستگی، رہنے سہنے کے طریقے، ترقی پسند رجحانات، اچھے اخلاق، مضبوط کردار، دینی اخوت اور روشن خیالی کی وجہ سے رفتہ رفتہ امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔

سرسید اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال رکھتے تھے جو ان کی زندگی میں پورا [illegible] ان کے بعد اس کالج نے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی اور نہ [illegible] پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ادارہ بن گئی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مدرسۃ العلوم کے قیام سے سرسید نے تعلیمی اصلاح اور قومی ترقی کی ایک نہایت اہم منزل بڑی کامیابی سے طے کرلی اور ان کے منصوبے عملی حقیقت بن کر سامنے آگئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرسیّد کو یہ خیال ہوا کہ صرف ایک کالج قایم کردینے سے پوری مسلمان قوم کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا۔ یہ کالج درحقیقت ایک نمونہ ہے اور اسی نمونہ پر ملک کے مختلف صوبوں اور حصوں میں مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے قایم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جو ملک کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کو اس کا موقع دے کہ وہ ایک جگہ جمع ہوکر اپنی قومی تعلیم اور معاشری ترقی کے مسائل پر غور اور تبادلۂ خیال کرسکیں اور مدرسۃ العلوم کے نمونہ پر متعدد ادارے مختلف حصّوں میں قائم کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں میں یہ اتحادِ عمل اور مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سرسیّد نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کے مقاصد یہ قرار دیئے گئے: مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔ علومِ مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بطور خود دیتے ہیں، اس کو تقویت دینا اور اس کو جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔ دیسی مکتبوں میں جو تعلیم قدیم طرز پر جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزّل ہوگیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ اور قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان مکتبوں کو قایم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔[۲۸]

اس کانفرنس کے بارے میں طے پایا کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر اس کا اجلاس ہوا کرے۔ جس میں مسلمانوں کی ترقی کی تجاویز پر غور کر کے ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر شہر اور ہر قصبہ میں کانفرنس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ جو اپنے علاقہ کے مدارس و مکاتب اور صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی حالت سے مرکزی دفتر کو مطلع کرتی رہیں۔ اس کانفرنس نے بہت سی عمدہ تجاویز منظور کیں مثلاً مسلمانوں کی تعلیمی مردم شماری کرنا، قرآن مجید کی تعلیمات کی اشاعت کرنا۔ اسلامی انجمنوں کے تعاون سے مسلمان طلباء کے لیے وظائف اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانا۔ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کرنا۔ تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہلِ اسلام کے مطابق مدرسے جاری کرنا۔ مسلمان طلباء کے لیے آسان زبان میں اخلاقی رسالے اور کتابیں شائع کرنا۔ مسلمانوں کی قدیم اور نایاب کتابوں کا جو کہ اب نادر الوجود ہیں پتہ لگانا اور ان کو حاصل کرنا۔ مسلمانوں کی علمی خدمات اور علمی اداروں کے متعلق تحقیقات کرنا۔ اور یورپ کے مورخوں نے مسلمانوں پر جو غلط الزامات لگائے ہیں ان کا نہایت مدلّل طور پر جواب دے کر غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا۔ کانفرنس کی تحریک پر بہت سے تحقیقی مقالے اور رسالے لکھے گئے اور متعدد کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ اس طرح یہ کانفرنس مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کا محور بن گئی۔ اور سرسیّد کی وفات کے بعد بھی روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ملک گیر تعلیمی تنظیم قایم کرنے کے منصوبے کو عملی شکل دی گئی۔ اور تعلیم کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں جو معاشرہ کی اصلاح کے لیے ناگزیر تھیں شدید مخالفت کے باوجود کامیابی ہوئی اور معاشری اصلاح و ترقی کا کام کرنے والوں کے لیے قابلِ تقلید مثال قایم ہو گئی۔

حوالے:۔

تہذیب الاخلاق جلد سوم۔ شمارۂ شوال ۱۲۸۹ھ

۲۔ سرسید کے آخری مضامین۔ مرتبہ امام الدین و احمد مخدومی۔ صفحہ ۲۳

۳۔ سفرنامۂ پنجاب (سید احمد خاں) مرتبہ سید اقبال علی۔ تقریر امرتسر جنوری ۱۸۸۴ء

۴۔ مجموعہ لکچر ہائے سید احمد خاں۔ مرتبہ سراج الدین احمد تقریر پٹنہ مئی ۱۸۷۳ء

۵۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ صفحہ ۷۵

۶۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق صفحہ ۵۶۔ (۷) ایضاً صفحہ ۴۶۰

۸۔ سرسید کے آخری مضامین۔ صفحہ ۲۷

۹۔ مقالاتِ سرسید۔ حصہ پنجم۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ صفحہ ۱۴۷

۱۰۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۱۴۸

۱۱۔ سفرنامۂ پنجاب۔ تقریر امرتسر۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۱۲۔ سفرنامۂ پنجاب۔ تقریر جالندھر۔ فروری ۱۸۸۴ء

۱۳۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۴۴

۱۴۔ مسافرانِ لندن (سفرنامہ سید احمد خاں)۔ (مجلس ترقی ادب لاہور) صفحہ ۲۹۰

۱۵۔ سرسید کے آخری مضامین۔ صفحہ ۲۶۔ (۱۶) ایضاً صفحہ ۲۰

۱۷۔ مسافرانِ لندن۔ صفحہ ۱۹۷ ۱۸۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق صفحہ ۴۵۴

۱۹۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۲۹۳

۲۰۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۵۷

۲۱۔ سید احمد خاں کے لکچرز و اسپیچز۔ تقریر گورکھپور۔ جولائی ۱۸۷۴ء۔ مرتبہ امام الدین

۲۲۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۱۸۷ ۲۳۔ مسافرانِ لندن۔ صفحہ ۲۱۵

۲۴۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۲۲۶

۲۵۔ ماخوذ از روئداد اجلاس ممبران کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان منعقدہ ۱۲ مئی ۱۸۷۲ء

۲۶۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۲۴۰ ۲۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۲۴۵۔

۲۸۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۳۰۲

چوتھا باب

دینی عقائد کی درستی

ہندوستانی مسلمانوں میں جو معاشری خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کا ایک اہم اور بنیادی سبب یہ تھا کہ انھوں نے ایسے عقائد و نظریات اختیار کر لیے تھے جو درحقیقت تو اسلامی تعلیمات کے برعکس تھے لیکن دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمان ان کو دین کے اہم اصول تصوّر کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان دوسری قوموں کے اصول و عقائد، رسوم و رواج اور توہمات سے متاثر ہوئے تھے اور ان کی زندگی میں غیر اسلامی اثرات اس حد تک سرایت کر گئے تھے کہ اس ملک میں اسلام کو خود مسلمانوں کے طرزِ عمل سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور مسلم معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی و اصلاح کے لیے عقائد و نظریات کو درست کرنا نہایت ضروری تھا۔ سرسیّد کو اس بات کا رنج تھا کہ مسلمان غیر اسلامی چیزوں کو اسلامی تصوّر کر کے ان پر عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو ان کی دینی و معاشری حالت بگڑ گئی ہے اور دوسری طرف اسلام کی بدنامی ہوتی ہے۔ کیونکہ لوگ مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اسلام کا اندازہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کی زبوں حالی کو اسلامی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اس غلط خیال کو دور کرنے اور مسلمانوں کی معاشری حالت کو بہتر بنانے کے لیے سرسید نے مسلمانوں کی دینی اصلاح کو لازمی قرار دیا اور ان کے عقائد درست کرنے کی جد و جہد شروع کر دی۔

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل اور ملک کے بدلے ہوئے حالات نے ہندوستان

میں اسلام کے لیے کئی خطرے اور مسائل پیدا کر دیے تھے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مسلمان صحیح اسلامی تعلیمات سے ناواقف تھے اور ان کی زندگی میں غیر اسلامی رنگ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندوستان پر عیسائیوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور عیسائیوں کے تبلیغی ادارے جن کو حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام پر طرح طرح کے الزام عائد کرتے تھے لیکن مسلمان خود اپنے مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی بنا پر ان کی مؤثر تردید نہ کر سکتے تھے اور عیسائی پروپگنڈہ سے ان کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا۔ اسلام کے مخالفوں نے عیسائیوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسلام انسانی ترقی اور تہذیب و تمدن کا مخالف اور خون آشام مذہب ہے اس لیے عیسائی مسلمانوں کو بہت خطرناک تصور کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے وہ ان کو اپنا شدید مخالف سمجھتے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء کی شورش عظیم نے ان کے اس اندیشہ کو درست ثابت کر دیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو موقع مل گیا تو وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس لیے انگریزوں کی پالیسی مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت پر مبنی تھی۔ انگریزوں نے جو طریقۂ تعلیم نافذ کیا وہ مسلمانوں کے دینی عقائد میں شکوک و شبہات اور انتشار پیدا کرنے والا تھا۔ چونکہ مسلمان اسلام سے صحیح طور پر واقف نہ تھے اور نئے نظامِ تعلیم میں ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ تھا اس لیے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام سے بدگمانی پیدا ہو جانے کا قوی امکان تھا اور بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لیے جدید انگریزی تعلیم حاصل کرنا بھی نہایت ضروری تھا۔ یہ وہ بڑے خطرات تھے جن پر غالب آنا ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے بہت ضروری تھا۔ اور سرسید نے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے دینی عقائد کی اصلاح کے لیے اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کیا۔ عیسائیوں کے

[illegible] دیا۔ انگریزی حکومت کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی اور جدید انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم و تربیت دینے کے منصوبہ کو بڑی خوبی اور کامیابی سے عملی شکل دی۔

مذہب کی سچائی اور فضیلت کا معیار

عقائد و نظریات کو درست کرنے کے لیے سرسید نے یہ کوشش کی کہ اسلام کا صحیح تصور مسلمانوں کے ذہن میں بیٹھ جائے۔ اور وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ محض عبادات اور رسوم و رواج کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے والا دین ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسان کی پوری زندگی کو سنوارنا اور نکھارنا ہے۔ اسلام کے اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے تمام اصول فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں اور اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو انسان کے مرتبہ کے منافی ہو یا جس پر عمل کرنا اس کے امکانات سے باہر ہو۔ اسلام کے بارے میں سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "کوئی مذہب ایسا دنیا میں نہیں ہے جو دوسرے مذہب پر گو وہ کیسا ہی باطل کیوں نہ ہو اپنی ترجیح بہ ہمہ وجوہ ثابت کر دے۔ مگر یہ رتبہ صرف اسی مذہب کو حاصل ہے جو نیچر کے مطابق ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ وہ صرف ایک مذہب ہے جس کو میں ٹھیٹ اسلام کہتا ہوں۔ اور جو بدعاتِ محدثات سے اور غلط خیالِ اجماع سے اور خطائے اجتہادات سے اور ڈھکوسلۂ قیاسات سے اور شکنجۂ اصولِ فقہ مخترعہ سے مبرا و پاک ہے۔"[1]

مذہب کی سچائی اور برتری کا معیار سرسید نے یہ قرار دیا کہ اس میں کوئی بات قانونِ فطرت کے برخلاف نہ ہو۔ کیونکہ قانونِ فطرت درحقیقت خدا کا فعل ہے اور جو مذہب واقعی خدا کا بھیجا ہوا ہوگا وہ خدا کا قول ہوگا۔ پس اس کے فعل اور اس کے قول میں مطابقت ہونا ضروری ہے۔ مذہب کو جانچنے کے اسی معیار کے مطابق انھوں نے اسلام کی سچائی اور فضیلت کو تسلیم کیا اور ۱۸۸۴ء میں لاہور میں اسلام پر

تقریر کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام فطری دین ہے۔ اس کے اصول فطرت کے مطابق ہیں۔ منطق و فلسفہ اور علمِ طبیعی میں کتنی کچھ تبدیلی کیوں نہ ہو اور ان کے مسائل اسلام کے مخالف ہی کیوں نہ معلوم ہوں اسلام ہی برحق اور سچا ہے۔ اسلام فطرتِ انسانی کے مطابق ہے اور یہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے۔ اسلام کے مسائل دو قسم کے ہیں منصوصی اور اجتہادی۔ خدا اور خدا کی وحدانیت پر ایمان اور تصدیقِ نبوت اسلام کے دو بنیادی رکن ہیں۔ اور اسلامی احکام کا وہ حصہ جس کو تمام مسلمان ملہم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمان کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبی سے ہاتھوں ہاتھ ہم تک پہنچا ہے اس کی پوری طرح تعمیل کرنا لازمی ہے۔ اور یہ حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائل حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائلِ حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے۔ لیکن اجتہادی مسائل صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ اور ان میں جو غلط ہوں ان کی اصلاح کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کیونکہ اجتہادی مسئلہ مجتہد کا خیال ہے جو خطا سے معصوم نہیں۔ چنانچہ اجتہادی مسائل اگر فطرتِ انسانی کے برخلاف ہوں تو اس سے اسلام پر حرف نہیں آتا۔ اور اصل اسلام کی جو روشنی ہے اس میں کچھ نقص نہیں آتا۔[۱۲]

دین و دُنیا میں تفریق کا رجحان

اسلام نے دین اور دُنیا میں تفریق کرنے کے بجائے ان میں ہم آہنگی پیدا کی ہے اور دونوں کی بہتری کے طریقے بتلائے ہیں۔ لیکن غیر اسلامی اثرات کے تحت مسلمانوں میں دین اور دنیا میں تفریق کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ سرسید کے عہد میں مسلمانوں کی اصلاح میں یہ خیال ایک بڑی رکاوٹ تھا کہ اصل چیز تو صرف نجاتِ اخروی ہے۔ دنیاوی نعمتیں حاصل کرنے کی خواہش بڑی گمراہی ہے۔ اس عقیدے نے مسلمانوں میں اس قدر غلط احساس پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنی تباہ حال زندگی کو سنوارنے اور ترقی کرنے کے خیال سے غافل ہو گئے تھے۔ اس رجحان کو ختم کرنے کے

لوگوں کو اپنی حالت کو بہتر بنانے پر متوجہ کرنے کے لیے سرسید نے ان کو یہ بتلایا کہ "نجاتِ ابدی جو سچے مذہب یا سچے دین کا نتیجہ ہے وہ دنیا کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے تمام عمر تنگی میں بسر کی ہو سچے مذہب کی بدولت نجاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے اور جس نے لاکھوں کروڑوں روپیہ جائز طور پر پیدا اور خرچ کیے ہوں وہ بھی سچے مذہب کی بدولت نجاتِ ابدی پا سکتا ہے۔ دنیا اور دین میں ایسا مستحکم رشتہ ہے جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔ جس طرح بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ فرض کرو کہ ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے پاس دولت و حکومت اور منصب نہ رہے۔ سب مفلس اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوں۔ اور در بدر بھیک مانگتے پھریں۔ اور ان کی اولاد جاہل اور نالائق، چور اور بدمعاش ہو۔ تو اس وقت ان کے دین کا کیا حال ہوگا۔ پیٹ ایک ایسی چیز ہے کہ دین رہے یا جائے۔ خدا ملے یا نہ ملے اس کو بہرحال بھرنا ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے بڑے دینداروں کی نسبت تو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ کسی جنگل میں گھاس چھیل رہے ہیں۔ کسی پہاڑ پر لکڑیاں چن رہے ہیں یا کسی کا گھوڑا مل رہے ہیں۔ لیکن جو ایسے پکّے دیندار نہیں ہیں وہ کیا کریں گے۔ معلوم نہیں کہ ان سے جیل خانے اور نوآبادیاں جزائر بھریں گے یا یتیم خانے اور کلیسیا رونق پائیں گے۔ پس ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیئے کہ دینِ اسلام کی کیا شان ہوگی۔

"اگر مسلمانوں کی حالت اتنی خراب ہو جائے کہ واعظین کو جو محض ریاکاری یا مکاری سے دنیا کماتے پھرتے ہیں کوئی ٹکا دینے والا یا حرام کا لقمہ تر کھلانے والا نہ رہے۔ جناب حضرت پیر جی صاحب جو لوگوں کو مرید کر کے اپنا لشکر بناتے پھرتے ہیں اور سالانہ ٹیکس یا جزیہ ان پر مقرر کرتے ہیں ان کو کوئی دینے والا نہ رہے یا جناب مولوی صاحب قبلہ جو حدیث و تفسیر یا صدرا و شمس بازغہ پڑھاتے ہیں ان کو کوئی نازبیجا کا نوکر رکھنے والا نہ رہے اس وقت ان سب کو یہ پتہ چلے گا کہ

مسلمانوں میں دنیاوی ترقی و تہذیب اور تربیت و شائستگی میں کوشش کرنا اور امر معاش میں منہمک ہونا امر معاد سے غفلت برتنا ہے یا یہ کام خاص خدا کا اور بالکل دین کا اور سرتاسر معاد کا ہے۔"

سرسیّد کا یہ خیال تھا کہ اگر مسلمانوں کی دُنیاوی حالت اچھی ہوگی تو اس سے ان کے دین کی بھی عزّت اور توقیر بڑھے گی اور اگر وہ دنیاوی اعتبار سے ذلیل و خوار ہوں گے تو ان کی اس حالت سے ان کے دین پر بھی بُرا اثر پڑے گا۔ چنانچہ ایسی حالت میں جب کہ مسلمان معاشی تباہی، معاشری بدحالی اور علم سے محرومی کے باعث روز بروز پست سے پست تر ہوتے جا رہے تھے اور ذلیل و حقیر سمجھے جاتے تھے اس بات کی کوشش کرنا کہ مسلمانوں میں قومی ترقی ہو۔ لوگ معاش سے فارغ البال ہوں۔ اکلِ حلال پیدا کرنے کے وسیلے ہاتھ آویں حُسنِ معاشرت میں جو نقص ہیں وہ رفع ہوں۔ جن بُری رسموں اور خراب عادتوں سے غیر قومیں مسلمانوں کو اسلام کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہیں وہ موقوف کی جائیں جو خلافِ شرع تعصبات و توہمات ہیں اور ہر طرح کی ترقی کے مانع ہیں وہ دور کی جائیں۔ یہ سرسیّد کے نزدیک محض دنیا پرستی نہ تھی بلکہ عین دین داری بھی تھی۔

عبادت کا مفہوم

عبادت کے متعلق مسلمانوں میں جو غلط تصور قائم ہوگیا تھا سرسید نے اس کی اصلاح کرنے کی بھی کوشش کی۔ لوگ اس چیز کو بھول گئے تھے کہ ایک فطری دین اس چیز کو پسند نہیں کر سکتا کہ عبادت قانونِ فطرت کے خلاف ہو اور انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرے جو فطرت نے اس پر عائد کیے ہیں۔ عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف لوگوں کا خیال یہ تھا کہ تمام رات نماز پڑھنا، ہمیشہ دن کو روزہ رکھنا یا کبھی شادی نہ کرنا قابلِ تعریف عبادت ہے۔ لیکن عبادات کا یہ ایسا تصوّر ہے جس کو خود حضور رسالت مآبؐ نے غلط قرار دیا ہے۔ سرسیّد نے حضورؐ کے اس خیال کو سند قرار دے کر مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ اصلی اور سچی عبادت وہی ہے جو قانونِ قدرت کے اصول

[illegible] تمام نیکیاں اور عبادتیں جو قانونِ قدرت کے برخلاف ہوتی ہیں وہ دنیوی نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہوتیں۔ تمام قوے جو خدا تعالیٰ نے انسان میں پیدا کیے ہیں وہ اس لیے پیدا نہیں کیے کہ وہ بیکار کر دیے جائیں بلکہ اس لیے پیدا ہوئے ہیں کہ سب کام میں لائے جائیں۔ اسلام نے ان قوے کے کام میں لانے کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس سے جملہ قویٰ اعتدال پر اور شگفتہ و شاداب رہیں اور ایک کے غلبہ سے دوسرا بیکار اور پژمردہ نہ ہو جائے۔ مگر بہت ہی کم لوگ ہیں جو اس نکتہ کو سمجھتے ہیں اور اس طریقہ کو جس کو ہمارے پیغمبر خدا صلعم نے رہبانیت قرار دیا ہے اور جس کو ہندی زبان میں جوگ کہتے ہیں کمالِ عبادت اور منتہائے زہد و تقوے قرار دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے مسلمانوں نے سوائے فرائض کے باقی عبادتوں کو صرف نماز روزہ و تلاوت قرآن مجید اور خیالی ترکِ دنیا اور درس و تدریس علومِ دینیہ اور اورادِ ماثورہ یا وظائف مقررۂ پیران ہی میں منحصر کر رکھا ہے حالانکہ انہیں پران کا انحصار محض غلط ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض ایسے درجہ پر پہنچ گئے ہیں جو قانونِ قدرت کے برخلاف ہیں اور اس لیے مقصودِ شارعؑ نہیں ہیں۔

زہد و ریاضت

مسلمانوں کے عقائد کو درست کرنے کے لیے سرسید نے اس خیال کو غلط قرار دیا جو زہد و ریاضت کے بارے میں عام طور پر پایا جاتا تھا اور اس بات پر بہت زور دیا کہ جو نیک کام ذکر و اشغال سے زیادہ مفید ہیں وہ بھی عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کو مناسب اہمیت نہ دینا بڑی غلطی ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ واضح کیا کہ ایک بڑی غلطی جس میں مسلمان پڑے ہیں وہ یہ ہے کہ انھوں نے زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل کرنے اور نفل پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے پر منحصر سمجھا ہے۔ زہد و ریاضت جہاں تک کہ حدِ شرعی سے تجاوز نہ کرے بلاشبہ نیکی و عبادت ہے۔ مگر عام [illegible] کرنا اور ایسے امور پر کوشش کرنا جو اپنے ہم مذہبوں کے دینی اور

دنیوی حال اور مال کی بھلائی و بہتری کے ہوں اس سے بہت [illegible]
زہد و ریاضت ایک بخیل نیکی ہے جو صرف اپنی ذات کے لیے کی جاتی ہے اور
اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک کوٹھری میں بیٹھ کر کھانا کھا لے اور صرف
اپنا پیٹ بھر لے۔ لیکن عام فلاح چاہنے والا جو اس کام میں زہد و ریاضت کرتا
ہے اس کی مثال حاتم کی سخاوت کی سی ہے جو ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلا کر
کھاتا ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی ہے کہ تن پروری کو تو عبادت سمجھا جائے اور اصلی
فیاضی اور سخاوت اور ہمدردی کو عبادات نہ سمجھا جائے۔

سرسید کے نزدیک حالات کے بدلنے سے عبادت اور ثواب کی نوعیت
بدل جاتی ہے۔ چنانچہ کسی مقام میں اگر پانی کا قحط ہو تو اس جگہ بیٹھ کر نفل
پڑھنے یا قرآن مجید کی تلاوت کرنے یا ذکر و شغل کی ضرب لگانے سے زیادہ
ثواب کا کام یہ ہے کہ کندھے پر مشک لاد کر لوگوں کو پانی پلایا جائے۔ اس لیے
ایک ایسے زمانے میں جب کہ مسلمانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی ہو ان کی
فلاح و ترقی اور بہتری کے لیے کوشش کرنا نفلیں پڑھنے اور رات کو جاگ کر
ریاضت کرنے سے زیادہ ثواب کا کام ہے۔

ترکِ دُنیا

مسلمانوں کے جو غلط رجحانات ان کے زوال کا باعث بنے
اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے جن کو ختم کرنا سرسید
نے ضروری سمجھا ان میں ترکِ دنیا کو عبادت تصور کرنے کا غیر اسلامی عقیدہ
بھی شامل تھا۔ اسلام اس کی اجازت تو ہرگز نہیں دیتا کہ انسان اپنے نفس کا
بندہ اور دُنیاوی لذتوں اور خواہشوں کا غلام بن جائے۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتا
ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو دنیاوی نعمتیں پیدا کی ہیں انسان ان سے مناسب طور
فائدہ اُٹھائے اور ان کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے استعمال
کرے۔ لیکن مسلمان جب اپنے مذہب کی تعلیمات سے دور ہونے لگے [illegible]
راہبوں اور جوگیوں کا اثر قبول کر لیا اور ترکِ دنیا کو عبا[illegible]

[illegible] دین اور اس کے معاشری مقاصد کے خلاف [illegible] مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ یہ خیال کہ ترکِ دنیا عبادت ہے ایک ایسا غلط اور جھوٹا قول ہے کہ اس سے زیادہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ دنیا ہمارے لیے پیدا ہوئی ہے اور ہم دنیا کے لیے۔ پھر ہم اس کو اس طرح پر جس طرح کہ جھوٹے دنیا ترک کرنے والے ترک کرنے کو کہتے ہیں کیوں کر ترک کر سکتے ہیں۔ ہاں جس طرح کہ شارع نے ترکِ دنیا کرنا بتایا ہے اسی طرح پر ترک کرنا سچا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم دنیا کو اس طرح پر پکڑیں جس طرح کہ شارع نے بتایا ہے نہ کہ اپنے جذباتِ نفسانی کی مرضی پر اور اس کو اس طرح پر کام میں لائیں جس طرح قانونِ قدرت نے ہم کو سکھایا ہے نہ کہ اپنی ہوائے نفسی کے مطابق۔ پس یہ بات سمجھنا کہ امورات دنیا میں مصروف ہونا عبادت نہیں ہے عین غلطی ہے۔ اس کو قانونِ قدرت کے برخلاف استعمال میں لانا شقاوت اور اس کے مطابق برتاؤ میں لانا عین عبادت ہے۔

سرسید اس خدا پرست کو نادان قرار دیتے ہیں جو صرف خدا کی محبت اور دنیا سے نفرت کا طلب گار ہو جس کو زہد و تقویٰ کے سوا اور کچھ کام نہ ہو اور دنیا کی طرف سے نہایت عاجز و ذلیل اور بے استطاعت و بے مقدور ہو۔ اور جو نہ خود عزت سے رہ سکے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے۔ اور اس کے برعکس ایسے دنیادار کو بہت دانا سمجھتے ہیں جو نیک کاموں کے لیے دنیا اور اس کی نعمتوں کا طلبگار ہو اور دنیا کی جاہ و حشمت سے مالا مال ہو کر قوم کی بھلائی اور ترقی کے اسباب مہیا کرے۔ کیونکہ ان کے نزدیک طوطے کی طرح اللہ اللہ جپنا اور یا ہو کبوتر کی طرح غٹر غوں غوٹر غوں کرنا اللہ کی یاد نہیں ہے۔ بلکہ اس نے جو چیزیں مرحمت فرمائی ہیں ان کو اسی کے کام میں صرف کرنا خدا کی یاد ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہم کو تمام [illegible] عطا کی ہیں کہ ہم خود بھی ان سے فائدہ اٹھائیں اور اوروں کو [illegible]

جس زمانہ میں سرسیّد علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کی فکر میں
رہے تھے دہلی کے نامور عالم اور مفسر قرآن مولانا عبدالحق دہلوی نے مدرسہ کے منصوبہ
پر کچھ اعتراضات کرکے دُنیا اور اس کی تمام چیزوں کو ناپائدار قرار دے کر یہ
نصیحت کی کہ انسان ہر دم کو دمِ واپسیں جانے اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو۔ سرسید
نے مدرسہ کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور مولانا کی نصیحت کا یہ
جواب دیا کہ "بلاشبہ یہ عمدہ نصیحت ہے مگر یہ ایسی بات ہے کہ اس کو ہر کوئی اعلیٰ
وادنیٰ، عالم و جاہل سب جانتے ہیں مگر افسوس کہ کرتا کوئی نہیں۔ اگر آپ خود ہی اس پر
عمل رکھتے ہوتے تو اخیر خط میں یہ ارقام نہ فرماتے کہ "نحن منتظر الجواب" کیونکہ
آپ کو یقین تھا کہ آپ میرا جواب پہنچنے تک زندہ رہیں گے۔ اس وقت آپ کو
اپنی اس نصیحت کا کہ ہر دم کو دمِ واپسیں جاننا چاہیئے کیوں خیال نہ رہا؟ میں
نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے اپنے رہنے کی کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی
بنوائی ہے۔ کبھی اپنے رہنے کے لیے چھپر چھلوایا ہے۔ آپ کے پاس پہننے کے کے جوڑے
ہیں۔ ان میں سے ایک تو آپ پہنے ہوئے ہوں گے۔ اور باقیوں کو پہننے کے لیے رکھا
ہوگا۔ کم سے کم نانبائی کو صبح شام کی روٹی پکانے کا حکم دیتے ہوں گے اور اس ماہ
مبارک رمضان میں سحری کے لیے بھی کچھ ضرور اُٹھا رکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو اس
نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ شاید ہمیں نفس نفیس واپسیں بود۔
پس جس بات پر کہ آپ کبھی عمل نہیں فرماتے دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں
نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی آسان ہیں مگر اس پر
کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا۔

"بندہ نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے مقدس عالموں کی خدمت میں حاضر
ہوا ہوں۔ بڑے بڑے بزرگوں اور درویشوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مگر اجمین
نورانی کا سب کو محتاج پایا۔ پھر آپ بھلا ایسی باتیں جاہل عوام [illegible]
کیوں فرماتے ہیں؟ ہمارے دین میں کچھ تنگی نہیں ہے جس سے [illegible]

[illegible] پرہیز کرنا چاہیے اور جس چیز سے ہم کو منع نہیں کیا وہ ہمارے لیے حلال اور مباح اور خدا کی نعمت ہے۔ ہم کو شریعتِ محمدیہ کی مطابقت میں خدا کی نعمتوں کو لوٹنے دو۔ وہ تو ہمارے خدا کی نعمتیں ہیں اور اس نے ہمارے لیے بنائی ہیں۔ پھر ہم نہ لوٹیں گے تو کون لوٹے گا۔ ہاں خدا سے یہ دُعا مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب سے مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لیے وقف کر دی ہیں بھول نہ جائیں۔"

سرسید کے اس جواب سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ دُنیا اور اس کی نعمتوں کو ناپائیدار قرار دے کر ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود بھی اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ ان میں اتنی ہمت و طاقت اور صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنی تباہ حال قوم کو زوال و ادبار کی پستیوں سے نکال کر راہِ ترقی پر گامزن کر سکیں۔ اس لیے وہ دین داری کا سہارا لے کر ایسی باتیں کہتے ہیں جو دین کے خلاف ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ قوم کے حق میں مزید تباہیوں کی شکل میں نکلتا ہے۔

پاک اور ناپاک علوم

غلط اور گمراہ نظریات نے مسلمانوں میں جو نقصان رساں عقائد پیدا کر دیے ہیں اور جن کو دور کیے بغیر معاشرہ کی حالت کو بہتر بنانا ممکن نہیں ہے، ان میں یہ غلط خیال بھی شامل ہے کہ صرف دینی علوم کی تحصیل تو عبادت میں داخل ہے لیکن دنیاوی علوم کو حاصل کرنا بے دینی اور گمراہی ہے۔ علمِ دین فقہ، تفسیر اور حدیث تک محدود ہے اور جو شخص ان کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کرتا ہے وہ خبیث بن جاتا ہے۔ علم کے متعلق یہ نظریہ سرسید کے نزدیک بالکل غلط ہے اور اسی سبب سے مسلمانوں میں روز بروز علم کا تنزّل ہو رہا ہے جس کی وجہ سے خود علمِ دین بھی معدوم ہوتا جاتا ہے۔ علومِ دینیہ کا صرف جاننا نہ کچھ عبادت ہے اور نہ کچھ ثواب۔ البتہ وہ اس وقت عبادت یا ثواب ہو سکتا ہے جب کہ اس کو امورِ دینی کے کام میں اللہ کی نیت سے پڑھا جائے۔ پس مدارِ عبادت و ثواب نیت پر رہا نہ کہ نفس

علم پر۔ اور یہی حال تمام باقی علوم کا ہے۔ وہ تمام علوم جن کو دنیوی کہتے ہیں دینی واستحکام اور تعلق علوم دینی کے لیے بھی ضروری ہیں۔ گو ان کا پڑھنا بھی فی نفسہ عبادت نہ ہو جیسا کہ علوم دینیہ کا پڑھنا بھی فی نفسہ عبادت نہیں ہے۔ مگر جبکہ علوم دنیوی اس نیت سے پڑھے جائیں یا پڑھائے جائیں کہ یہ علوم دینیہ کے لیے مثل آلہ کے ہیں تو ان کا پڑھنا یا پڑھانا بھی ویسا ہی عبادت ہے جیسا کہ علوم دینیہ کا ہے۔

علاوہ اس کے علوم دنیوی بھی اگر ان کی تعلیم نیک طرح پر ہو تو باعث ترقی ایمان ہوتے ہیں۔ ہم علم ریاضی پڑھ کر خدا تعالےٰ کی اس قدرت کاملہ سے واقف ہوتے ہیں جو خلق آسمان و زمین و کواکب و سیارہ و ثوابت میں کام آئی ہے جس وقت ہم علم ارض پڑھتے ہیں تو ان عجائبات سے واقف ہوتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے اس کرۂ خاک میں بنائے ہیں۔ علم نباتات اور علم حیوانات سے جب ہم واقف ہوتے ہیں تو پھولوں کی پنکھڑیوں کی رنگ آمیزی اور مکھی کی آنکھ کی پچی کاری ہم کو حکیم مطلق کی حکمت کاملہ پر یقین دلاتی ہے۔ اسی طرح تمام علوم ہماری معرفت کو قوت بخشتے اور خدائے واحد پر ہمارے ایمان کو اور مستحکم کرتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے اگر ہم ان علوم کو بھی علوم دینیہ میں شامل سمجھیں تو کچھ بعید نہیں۔ خدا تعالےٰ نے ہم کو ایسا عمدہ مذہب دیا ہے جو ہماری معاد اور معاش دونوں کو قانون قدرت کے مطابق اصلاح کرنے اور ترقی دینے والا ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دنیوی کی تحصیل کریں تو دین کا کیا حال ہوگا۔ اسی طرح یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر تمام لوگ صرف علوم دینی پڑھا کریں تو ہماری دنیا کا جس کی اصلاح شریعت سے خارج نہیں ہے، کیا حال ہوگا۔ علوم دنیاوی کے معدوم ہونے سے دین اور علوم دینی دونوں کے معدوم ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ہم دونوں قسم کے علوم کی ترویج پر سعی و کوشش کریں اور ایک کو دوسرے کا آلہ سمجھ کر دونوں کو پڑھنا اور پڑھانا داخل عبادت جانیں۔

ثواب اور اس کا مقصد

مسلمانوں کا ایک اور عقیدہ جس کو سرسید معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے بدلنا چاہتے تھے ثواب کا غلط تصور تھا۔ چند ایسے کام تھے جن کو کرنا مسلمانوں کے خیال میں کارِ ثواب تھا اور مسلمان یہ سمجھ کر ثواب کے یہ کام انجام دیتے تھے کہ اس کے بدلے میں ان کو جنّت ملے گی۔ سرسید کے نزدیک ثواب کا یہ تصوّر بہت محدود، غلط اور خود غرضی پر مبنی تھا۔ اور اُنھوں نے اس خیال کو بدلنے کی کوشش کی۔ عام طور سے ثواب کے جو غلط معنی لیے جاتے تھے ان کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ جب ہم پچھلے زمانے پر نظر کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں۔ ہر طرف ہزاروں کھنڈرات مسجدوں، پلوں، کنوؤں اور مہمان سراؤں کے نظر آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپے لگا کر لوگوں نے مہمان سرائیں بنوائیں۔ کنوئیں کھدوائے۔ اور پل بنوائے۔ سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے بُرج سونے کے کام سے مغرق تھے۔ سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجد کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بڑی بڑی عالی شان خانقاہیں بھی تعمیر کیں جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن مدرسوں کے کچھ زیادہ نشانات نہیں ملتے۔ تاہم کئی مدرسے بھی قائم کیے گئے جن کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ اور کئی مدارس اب بھی جاری ہیں۔ یہ آثار دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے۔

لیکن جب زیادہ غور کرتے ہیں تو سب دھوکہ ہی دھوکہ نظر آتا ہے جنھوں نے یہ کام کیے اور کر رہے ہیں ان کے دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب کام اسی خیالی جوش میں کیے ہیں کہ ہم ثواب کے کام میں مصروف ہیں اور ثواب کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں۔ مرتے ہی یہ سب کام ہم کو بہشت میں لے جائیں گے اور بہشت میں ہم بڑے بڑے درجے پائیں گے۔ ہمارے سر پر تاج ہوگا۔ اور ایک محل جنّت میں ملے گا۔ حوریں تصرّف کو ہوں گی جن کو ہمارے سوا کسی نے

چھوا بھی نہ ہوگا۔ پھر ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی۔ بے انتہا [illegible]
غلمان بھی نہایت خوبصورت ہوں گے۔ باغ ہوگا۔ میوہ ہوگا۔ نہریں ہوں گی۔
شراب ہوگی۔ پئیں گے اور چین کریں گے۔ بہشت میں یہ عیش و عشرت حاصل
کرنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں سرسید نے ان کو قومی ہمدردی کے بجائے
خود غرضی اور بالکل ایسے ہی کام قرار دیا ہے جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں انہی
عیشوں کو حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے۔ اگر باغبانوں کو مزدوری دے کر اپنے
چین کے لیے باغ لگوانا۔ مزدوروں کو مزدوری دے کر اپنے آرام کے لیے محل
بنوانا اور کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لیے شراب کھنچوانا قومی ہمدردی اور
کارِ ثواب نہیں ہے تو پھر وہ کام جو جنّت میں عیش کرنے کی غرض سے کیے جاتے
ہیں قومی ہمدردی اور ثواب کے کام کیسے ہو سکتے ہیں۔

ثواب کے کاموں کو مسجدوں، خانقاہوں اور تالابوں کی تعمیر تک محدود
رکھنے اور جنّت میں عیش کرنے کی غرض سے یہ کام کرنے کے رجحان کو بدل کر قوم
کی فلاح و ترقی کے لیے تمام ضروری کام انجام دینے پر لوگوں کو متوجہ کرنے کے
لیے سرسید نے یہ بتلایا کہ "اسلام کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ اس کام کے کرنے میں ثواب
ہے جس کی ضرورت ہے۔ دیکھو کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اس وقت
بڑی ضرورت تھی۔ مگر فتح مکہ کے بعد اس کا اجر کچھ بھی نہ تھا۔ جیش اسامہ کی تجہیز
کے لیے جو چار ٹکے کا اسباب ابو بکر صدیقؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر
اس کی برابری کوہ اُحد کے برابر سونا بھی نہیں کر سکتا۔ یہی سچا اصول مذہب
اسلام کا ہے۔"[۹۴]

ثواب کے کام

مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو خدمتِ خلق کو نیکی اور
ثواب کے کام سمجھتے تھے۔ اور نیک کام کرنے کی انتہائی
کوشش اپنے نقطۂ نظر کے مطابق کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں کا نیکی اور خیر کا
تصوّر چونکہ بہت محدود تھا اس لیے وہ قوم کی فلاح و بہبود کے [illegible]

[illegible] اہم اور ضروری پہلوؤں پر توجہ نہ کرتے تھے۔
[illegible] کے کام بس اسی حد تک محدود تھے کہ مسجدیں بنوادیں
[illegible] کے لیے کنویں کھدوادیں۔ اور عبادت وریاضت میں مصروف
رہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال نے مسلمانوں کو جن مشکلات
میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے بگڑے ہوئے حالات نے معاشری اصلاح، اقتصادی
بہتری اور قومی ترقی کے لیے جن مسائل کو حل کرنا ناگزیر بنا دیا تھا ان پر قابو پانے
کی تدبیریں ان کی نظر میں نہ تو نیکی اور ثواب تھیں اور نہ خدمتِ خلق۔ سرسید
یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اس حقیقت کو محسوس کریں کہ مسلمانوں کی معاشری
زندگی کے مختلف شعبوں میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہندوستان میں
اسلام اور مسلمانوں کے وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ اور اس زمانے میں
سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑا ثواب کا کام قوم کی خدمت کرنا اور اس کو
تباہی و بربادی سے بچانے میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ انھوں نے لوگوں کے دل میں
یہ خیال بٹھانے کی کوشش کی کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے اور ہمیشہ رہنے والی نیکی
سب نیکیوں سے افضل و اعلیٰ ہوتی ہے۔ انسانوں میں نیک وہ ہے جو بہت
سی نیکیاں کرے مگر سب سے زیادہ نیک وہ ہوگا جس کی نیکیاں سب سے
افضل اور اعلیٰ ہوں۔ بعض لوگوں نے پل، مسجدیں اور کنویں بنوائے اور ان
چند روزہ رہنے والی نیکیوں کو خیر دائم سمجھ لیا۔ بعض لوگوں نے خیر خیرات میں
زہد و تقویٰ اور عبادت کو خیر دائم خیال کیا۔ لیکن ان کی یہ نیکیاں خیر دائم نہیں
بلکہ چند روزہ ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے تو بجز
رفاہِ عام اور انسان کی بھلائی چاہنے کے اور کوئی نیکی خیر دائم نہیں ہے۔ انسان
کی بھلائی نہ تو نیکی کرنے والے کی موت سے ختم ہوتی ہے اور نہ اس زمانے کے
[illegible] ہونے سے فنا ہو جاتی ہے۔ بلکہ نسل در نسل اور پشت در پشت
[illegible] آتی ہے اور قیامِ دنیا تک دائم رہتی ہے۔ اس لئے

صرف یہی ایک نیکی ہے جس کو خیرِ دائم کہہ سکتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے انسان کی بھلائی چاہنے کی خدمت انبیاء کو عطا کی ہے۔ انسان کی بھلائی میں سعی کرنا انبیاء کا ورثہ لینا ہے۔ اور تمام نیکیوں میں افضل اور اعلیٰ نیکی کا اختیار کرنا ہے پس فلاح عام کے کاموں کو عباداتِ دینی میں سے نہ سمجھنا اور صرف نوافل اور تسبیح و تہلیل کو عبادت جاننا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خیرِ دائم اور بھی زیادہ نیک اس وقت ہو جاتی ہے جب اس کی ضرورت ہو۔ اور موجودہ زمانہ میں اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے اس کی بہت ضرورت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ صرف تسبیح و تہلیل و زہد و تقوےٰ ہی پر تکیہ نہ کریں اور صرف ادائے زکوٰۃ اور قضائے دارین ہی پر اقتصار نہ کریں بلکہ تھوڑا سا وقت اور دو چار درہم رفاہ و فلاح حال مسلمانان کے لیے بھی نکالیں اور خیرِ دائم کی نیکی کو بھی حاصل کریں۔

سرسید کو اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں جو رکاوٹیں پیش آ رہی تھیں ان کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان اس کارِ خیر کو محض ایک دنیاوی معاملہ سمجھتے تھے اور اس کو اپنا دینی فرض اور افضل و اعلیٰ نیکی خیال نہ کرتے تھے۔ سرسید کو اپنی ان مشکلات کا احساس تھا اور وہ ان کو دور کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسۃ العلوم کی امداد کے سلسلہ میں مولوی محمد علی حسن خاں کو لکھا تھا کہ "ایک عام خیال نسبت حسنات و خیرات و مبرات کے محدود ہو گیا ہے۔ اس خیال کو توڑنا اور یہ بات دل میں ڈالنی کہ درحقیقت جس امر کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اور جس کے نہ ہونے سے مسلمانوں کی روز بروز ذلت ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کی بھی ذلت ہے اس میں تائید کرنا اور اس ذلت سے مسلمانوں کو نکالنا سب سے بڑی حسنات میں شامل ہیں۔"

تقلید پرستی

اسلام ایک ایسا دین ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ دنیا کی تمام قوموں کے لیے ہے اور ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ جو مذہب اس قدر

[illegible] حالات میں نئے نئے مسائل حل کرنا ہوگا اور زمانے [illegible] اصول و مقاصد سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ ورنہ انسانی [illegible] پیدا ہوگی اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والا مذہب محض بے جان [illegible] کر غیر مؤثر ہو جائے گا۔ اسلام نے انسانی معاشرہ کی اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کو اجتہاد کرنے کا اختیار دیا ہے تاکہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمانے کے نئے نئے تقاضوں کو پورا کر سکیں اور اسلامی معاشرہ کی ترقی میں رکاوٹیں حائل نہ ہوں۔ لیکن جب مسلمان زوال پذیر ہو گئے تو انھوں نے اجتہاد کو ترک کر کے محض تقلید کا طریقہ اختیار کر لیا اور یہ فرض کرنے لگے کہ اجتہاد کی آزادی تو اماموں پر ختم ہو گئی۔ ان کے بعد اجتہاد کی مطلق گنجائش نہیں اور اب مسلمانوں کا کام صرف یہی رہ گیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی امام کی تقلید کریں چنانچہ تقلید کے اس غلط تصور نے اسلامی معاشرہ کی ترقی کو روک دیا اور وہ زوال پذیر ہو گیا یہاں تک کہ اس کی حالت انتہائی پست ہو گئی اور مسلمان اسلام سے بہت دور ہو گئے۔

سرسید کے خیال میں مسلمانوں میں تقلید کا یہ رجحان ان کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ اور ان کے زوال و ادبار کا ذمہ دار تھا۔ وہ اماموں کا احترام کرتے تھے۔ لیکن یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے کہ انھوں نے جو رائے قائم کی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور ہمیشہ اسی رائے پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اجتہاد کا دروازہ بند کر کے محض تقلید کرتے رہنے سے مسلمانوں اور اسلام کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان تقلید کے بارے میں اپنا نظریہ بدل دیں۔ چنانچہ محسن الملک کے نام ایک خط میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ [illegible] تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث صحیح سے [illegible] تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ [illegible] مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اس خیر خواہی

نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں [illegible]
کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے [illegible]
میں داخل ہونے کے لیے اکابر درکنار مولوی جیو کی بھی تقلید کافی ہے۔ کیونکہ
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست
باقی نہیں رہتی۔ پس میں دشمنِ اسلام ہوں یا مثل ابوبکرؓ و عمرؓ کے دوست اسلام
ہوں[۱۲]۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں کہ جس قدر نقصان اسلام کو تقلید نے پہنچایا ہے اتنا
کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ سچے اسلام کے حق میں تقلید سنکھیا سے بھی زہر قاتل ہے۔
بلاشبہ ہم نے علماء کو مثل یہود و نصاریٰ کے ارباب من دون اللہ سمجھ لیا ہے۔
خدا اس گناہ سے سب مسلمانوں کو بچائے[۱۳]۔"

سرسید اسلام اور مسلمانوں کی بقا و ترقی کے لیے اجتہاد کو لازمی خیال کرتے ہیں اور ان کی رائے یہ ہے کہ "متاخرین اہلِ سنت و جماعت نے عجیب غلط مسئلہ بنایا ہے کہ اجتہاد ختم ہو گیا اور اب کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا۔ اکثر علماء دین کا یہ مذہب ہے کہ ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضروری ہے۔ پس کیسی بڑی غلطی اہل سنت و جماعت کی ہے کہ اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم مانتے ہیں۔ اس غلط اعتقاد نے مسلمانوں کو دین و دنیا میں نہایت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس خیال کو چھوڑ دیں اور ہر بات کی تحقیق پر مستعد ہوں۔ خواہ وہ بات دین کی ہو یا دنیا کی۔ غور کرنا چاہیے کہ ہر گاہ زمانہ حادث ہے اور نئے نئے امور اور نئی نئی حاجتیں ہم کو پیش آتی ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد نہ ہوں گے تو ہم مُردہ مجتہدوں سے نئی بات کا مسئلہ جو ان کے زمانے میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی کیوں کر پوچھیں گے۔ پس ہمارے لیے بھی مجتہد العصر والزمان کا ہونا ضروری ہے۔" جو لوگ اکابر کے اجتہاد کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں اور ہر زمانے میں ان کی تقلید کرنے کے قائل ہیں وہ لوگ سرسید کے نزدیک گمراہی میں مبتلا ہیں اور ان کا یہ خیال [illegible]
چاہتا ہے جو صرف رسولؐ کے لیے ہے۔ کیونکہ ان کا یہ خیال [illegible]

[illegible] ہے اسی طرح رسولؐ کو تبلیغ احکام یا احکامِ شریعت [illegible] ہے اور کسی کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ پس جو [illegible] کے سوا کسی اور شخص کے احکام کو دین کی باتوں میں اس طرح پر واجب [illegible] سمجھتا ہے کہ اس کے برخلاف کرنا گناہ ہے اور اسی کی تابعداری کو باعث نجات یا ثواب سمجھتا ہے وہ بھی ایک قسم کا شرک کرتا ہے جس کو میں شرک فی النبوۃ سے تعبیر کرتا ہوں۔"

پیری مریدی

سرسید کے زمانے میں پیری مریدی کا جو طریقہ رائج تھا وہ بہت نقصان رساں اور گمراہ کن تھا اور مسلمانوں کی دینی و معاشری اصلاح کے لیے اس خرابی کو دور کرنا نہایت ضروری تھا۔ سرسید نے اپنی قومی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی اس طریقہ کی برائیوں اور مضرتوں کو محسوس کر لیا تھا اور مسلمانوں کو اس کی اصلاح پر متوجہ کرنے کے لیے ایک رسالہ کلمۃ الحق لکھا تھا جو ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۲ء میں انھوں نے ایک مضمون نمیقہ در بیان مسئلہ تصور شیخ شائع کیا۔ ان دونوں میں سرسید نے پیری مریدی کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے۔ یہ ان کی اصلاحی سرگرمیوں کا ابتدائی دور تھا۔ اور ان کی روش میں وہ شدت نہ تھی جو آگے چل کر پیدا ہو گئی۔ تاہم انھوں نے پیری مریدی کے مروجہ طریقہ کی خرابیاں اور نقصانات بیان کر کے ان کی مخالفت کی۔ سرسید اس کے مخالف نہ تھے کہ کوئی شخص اپنے پیر سے روحانی رہبری حاصل کرے۔ بلکہ وہ انسان کی روحانی تربیت کے لیے اس چیز کو مفید سمجھتے تھے کہ کوئی شخص ایسے روحانی پیشوا سے فیض یاب ہو جو عالم، فاضل، متقی و پرہیزگار اور اعلیٰ اوصاف و کردار کا مالک ہو لیکن نفس پرست، مکار اور دھوکہ باز پیروں کے وہ شدید مخالف تھے اور اس زمانے کے پیر [illegible] اسی قسم کے تھے۔ سرسید پیری مریدی کے کسی سلسلہ میں منسلک ہونے [illegible] کو ایک قسم کا تجارتی کاروبار بنا لینے کے سخت مخالف

تھے اور پیر پر اس قسم کے اعتقاد کو گمراہ کن سمجھتے تھے کہ وہ [illegible]
اس کی دی ہوئی جڑی بوٹی اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اور مرنے کے بعد [illegible]
آئے گا۔ ایسے گمراہ کن خیالات کے بجائے سرسید یہ چاہتے تھے کہ لوگ اس
بات پر پورا یقین رکھیں کہ قبر میں ہر شخص کے نیک اعمال ہی اس کے کام آئیں گے
اور وہ اس دنیا میں اچھے کام کر کے ان کا اجر پائے گا۔

اسی طرح سرسید روحانیت بڑھانے کے ان متعدد طریقوں کے مخالف
تھے جو اس زمانے میں رائج تھے۔ وہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ تصوف سے
روحانیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کے خلاف تھے کہ تصوف اور
روحانیت کو جادوگروں جیسے کرتب دکھانے کا ذریعہ بنایا جائے۔ چنانچہ
انھوں نے اس کی مخالفت کی کہ پیر اور مرید کے درمیان روحانی ربط قائم کرنے
کے لیے تصور کی مشق کی جائے اور اس کو اتنا بڑھایا جائے کہ حالتِ مراقبہ میں
مرید اپنے شیخ کو نظروں کے سامنے موجود پائے۔[۱۵]

پیری مریدی کے مروجہ طریقوں نے عوام کے عقائد میں بڑی خرابیاں پیدا
کر دی تھیں جن کو دور کرنا سرسید بہت ضروری خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں
نے شریعت کو صحیح راستہ قرار دے کر عوام کو گمراہی سے بچانے کی کوشش کی
انھیں اس بات کا احساس تھا کہ ہمارے زمانے میں پیری مریدی کا ایک ایسا
جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکے میں پڑے ہیں۔ جہاں ایک
نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال اور کوئی
ولی اور کوئی غوث اور پھر وہ کیسی ہی باتیں کرتا ہو اس پر کچھ خیال نہیں کرتے۔
اگر کوئی کہے کہ "میاں یہ تو شرع کے خلاف باتیں کرتا ہے" تو یوں جواب دیتے ہیں
کہ "اجی تم نہیں جانتے طریقت کا اور ہی راستہ ہے۔ فقیروں کی باتیں ہی جدا ہیں
شریعت تو ظاہر کے لیے ہے۔ یہ ولی اللہ کے ہیں جو کرتے ہیں [illegible]
مسلمانوں کے دل سے ایسے غلط اور گمراہ کن [illegible]

[illegible] اس حقیقت کو واضح کیا کہ اللہ کی راہ نبی کی [illegible] ہی نہیں۔ جو ذرا بھی شریعت کی راہ سے بھٹکا وہی راہ بھولا۔ اگر کوئی آسمان پر اڑے اور زمین میں گھسے اور ایک بال بھر شریعت سے پھرا ہو وہ گمراہ ہے۔ ولی وابدال، غوث اور قطب ہونا کچھ کرشمہ اور کرامات نہیں ہے۔ بھوت اور پلیت، دیو، جن، نٹ اور بھان متی بھی بہت سے شعبدے اور تماشے دکھاتے ہیں۔ ولی وابدال، غوث وقطب وہی ہے جو پورا پورا شریعت پر چلے .... وہ راہ جس سے خدا ملتا ہے وہ رسول اللہ ہی کی سنت ہے اور اس کے سوا سب راہیں شیطان کی ہیں۔ ہر مداری سدھاری کو تم پیر مت بناؤ، اور اس کے کرشمے اور کرامات پر مت جاؤ۔ بلکہ جو شخص سنتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تابع ہو اسی کو ولی اور غوث اور قطب اور ابدال سمجھو گو اس سے ایک بھی کرامت نہ ہو۔ کیونکہ کرامت ہونا ولی ہونے کی نشانی نہیں۔ بلکہ رسول اللہ کی سنت اور شریعت کا تابع ہونا ولی ہونے کی علامت ہے۔

اور ہم کو صرف محمد رسول اللہ کی شریعت اور سنت پر چلنے سے دونوں جہان کی نعمت ملتی ہے۔ نہ کسی پیر کی حاجت نہ کسی فقیر کی۔ اور نہ کسی نئے ذکر کی درکار اور نہ کسی نئے شغل کی۔ جو ہمارے حضرت نے ہم کو بتلا دیا ہے وہی کافی ہے۔[۱۶]

پیری مریدی کے طریقہ میں کس قدر خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور پیروں کی حالت کس قدر افسوسناک تھی اس کا اظہار سرسید نے مختلف تحریروں اور تقریروں میں کیا ہے۔ امام غزالی کے ایک رسالہ پر تبصرہ کے سلسلہ میں انھوں نے مشائخ وعلماء کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کر کے ان کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں اس طبقہ کی کیا حالت تھی اور سرسید [illegible] کے مخالف کیوں تھے۔ انھوں نے یہ کیفیت بڑے دلچسپ انداز میں [illegible] ہے جس وقت کہ پیر صاحب یا مولوی صاحب کے گردان کے [illegible] ہوتا ہے اور حجرِ اسود کی مانند ان کے دستِ مبارک کو بوسہ

دینے کو لوگ دوڑتے ہیں تو ان کا دستِ مبارک [illegible]
ہو جاتا ہے۔ مولوی صاحب، حضرت صاحب کی آواز کا [illegible]
کان میں آنا چاہئے شانِ کسرائے و کیقباد کی آواز سے بھی قوی اثر ان کے دل پر ڈالتا
ہے انکسار و مسکینی ان کو آسمان پر چڑھاتی جاتی ہے۔ اس لیے وہ اور زیادہ
مسکین اور منکسر ہوتے جاتے ہیں۔ سادہ وضعی پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لیے
وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ دُنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اس لیے وہ
دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی حاجت سے زیادہ بغیر محنت کے
درہم و دینار دلا دیتی ہے اس لیے وہ زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی
ہر ایک بات پر لوگ آمنا و صدقنا کہتے ہیں اس لیے ان کے دل میں دوسرے
کی بات کی حقارت جمتی جاتی ہے۔ ہاتھوں کو چھواتے چھواتے، ہر ایک مشکل کے
حل کی دُعائیں منگواتے منگواتے، ہر ایک مسئلہ کا فتوے دیتے دیتے ایک اور
بیماری ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب بُرائی بھلائی، دوزخ و بہشت،
کفر و ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھنے لگتے ہیں۔ کسی کو کافر بنا دیتے ہیں اور
کسی کو مرتد۔ کسی کو جہنم دیتے ہیں اور کسی کو بہشت۔ کبھی خازنِ جنّت اور کبھی
مالکِ جہنّم۔ دل میں خدا کے نور کے بھڑکنے کے خیال سے ظلمت پر ظلمت میں پڑتے
جاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں مل ملا کر حضرت کو ایک ایسا شخص بنا دیتی ہیں جو پھول
پھلا کر کُپّا ہو جاتا ہے۔ نہ کان رہتے ہیں جو کچھ سُنیں۔ نہ آنکھیں رہتی ہیں جو کچھ
دیکھیں۔ نہ مُنہ رہتا ہے جو حق بات کہیں۔ جو سرور اور دلی آسائش اور دل کے
پھولنے سے جو مزا اس فرقہ کو آتا ہے نہ کسی دنیادار کو میسر ہوتا ہے نہ کسی
دولت مند کو اور نہ کسی صاحبِ تخت و سلطنت کو۔ وہ زبان سے اپنے تئیں
گنہ گار کہتا ہے مگر اس کا دل اس کو جھٹلاتا رہتا ہے۔ اس کے کوئی وہ ایک
نیکی اور تعلّی سمجھتا ہے۔ اپنی چال ڈھال شریعت کے موافق بناتا ہے مگر اس کا
دل روز بروز سیاہ ہوتا جاتا ہے۔ ازار کے دو انگل [illegible]

[illegible] کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے۔ پانی کے [illegible] رات بحث کرتا ہے۔ لمبے لمبے فتوے لکھتا ہے۔ مگر دل کو [illegible] کرنے کا خیال ہی نہیں کرتا۔ اکل حلال اور صدقِ مقال پر لمبے [illegible] ہے کہ جب کوئی لقمہ تر آجائے تو جھٹ نگل جاتا ہے۔ اور اگر کبھی آگل دیتا ہے تو اس امید پر کہ اس سے بھی زیادہ لقمہ تر یہ تر آوے گا۔"

پیری مریدی کے طریقے نے ایک اور بُرا اثر یہ ڈالا کہ پیروں نے اپنی بزرگی اور برتری جتلانے کے لیے اپنی رفتار و گفتار، نشست و برخاست غرض کہ پوری زندگی کو ایک ڈھکوسلا بنا لیا اور ان میں انتہائی رعونت پیدا ہو گئی جس کو سرسیّد نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "جو وقت کہ حضرت کے باہر تشریف لانے کا ہے اس کے سوا اور وقت تشریف لانے ہی کے نہیں۔ اور جو وقت آپ کی بات کرنے کا ہے اس کے سوا بات کرنے ہی کے نہیں۔ جو دن کہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کے جمع کرنے کا ہے اس دن کو ناغہ کرنے ہی کے نہیں۔ کوئی مرتا مرکیوں نہ جائے آپ عیادت کو تشریف لانے ہی کے نہیں۔ جب تک کہ جھک کر تسلیمات نہ کی جاوے اور قدم آنکھوں سے نہ لگائے جائیں حضرت کا مزاج خوش ہونے ہی کا نہیں۔ سلامُ علیک کا جواب زبان سے نکلنے ہی کا نہیں۔ قدم چومتے وقت سر پر ہاتھ پھیرنے کے سوا مصافحے کو کبھی ہاتھ اُٹھنے ہی کا نہیں۔ اور جب تک کہ حضرت صاحب اور شاہ صاحب اور میاں صاحب اور مولوی صاحب کہہ کر بات نہ کی جائے تیوری کا بل اُترنے ہی کا نہیں۔"

یہ پیروں کی حالت کا نہایت صحیح نقشہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ میں ایسے لوگ دین کے حامی و محافظ سمجھے جائیں اور جاہل عوام پر ان کی گرفت [illegible] ہو اس معاشرہ کی حالت کس قدر خراب ہو گی۔

[illegible] مولویوں کا یہ گمراہ اور تباہ کار طبقہ عالم و فاضل ہونے کا بھی [illegible] کی دینی تعلیم انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسلام کے اصل

مقاصد اور اس کے بنیادی اصولوں کی حکمت سے بالکل [illegible]
اور غیر ضروری مسائل اور مہمل کہانیوں کو اپنے علم و فضل کے اظہار [illegible]
ان کے متعلق وعظ کہتے اور جاہل عوام کی جہالت میں اضافہ کرتے تھے۔ سرسید
مولویوں کی اس حالت اور دعووں کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہت نقصان دہ
سمجھتے تھے اور اسی لیے ان کے شدید مخالف تھے چنانچہ انھوں نے نواب محسن الملک
کو یہ لکھا تھا کہ "افسوس! صد افسوس!! ہمارے ہاں کے مولویوں نے ایسے صاف
اور روشن مذہب کو لغو اور مہمل کہانیوں میں ڈال دیا ہے۔ اور جب کوئی چاہتا
ہے کہ اس کی تحقیقات کرے اور اس پر غور کیا جائے تو وہ اس کو کافر، لامذہب، مرتد
اور عیسائی کہتے ہیں۔ میں خدا کا اور اس کے رسول کا اور ان کے کلام کا دوست
ہوں۔ ملا مولویوں کا دوست نہیں ہوں جو مثل یہودیوں اور عیسائیوں کے
ان کو اربابا من دون اللہ سمجھوں۔۔۔ جس قدر میں مولویوں سے ناراض ہوں
ایسا کسی سے ناراض نہیں۔ زندہ مولویوں اور بالتخصیص واعظوں کا تو جانی
دشمن ہوں۔ اور گذشتہ مولویوں سے سوائے چند کے رنجیدہ ہوں۔ ان میں سوائے
چند کے کسی کو لکھنے اور کتاب تصنیف کرنے اور کسی بات کی تحقیق کرنے کا مطلق
سلیقہ نہ تھا۔ صرف جنگل میں سے بھلی اور بری، سوکھی اور گیلی لکڑیاں چننے والے تھے۔
خدا ان پر رحم کرے اور ان کی تقلید کرنے والے اندھوں کو خدا ہدایت کرے"[۱۹]

مولویوں اور واعظوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ ان کی اصلاح کرنا
ایک ضروری کام تھا۔ لیکن سرسید اس کو تقریباً ناممکن خیال کرتے تھے چنانچہ
انھوں نے محمد ابراہیم آروی کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ "میرے نزدیک
علماء کی اصلاح اگر ناممکن نہیں تو قریب قریب محال کے ہے۔ نفاق اور عناد اور
تفوق ایک دوسرے پر۔ اور بعضوں کا دینداری کو ذریعہ معاش بنانا اور تقلید
میں ایسا غلو کرنا کہ شرک فی النبوۃ کی حد تک پہنچ گیا ہے اور [illegible]
اختلاف میں ایک دوسرے کو کافر و مشرک کہنا اور [illegible]

[illegible] رسول اللہ سے بندھی ہوئی ہے اس کو [illegible] ہو گیا ہے۔ جب یہ حال ہے تو خدا ہی ان کی اصلاح کرے [illegible] اسباب میں تو ہوتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔" اس صورت میں کہ مولویوں کا یہ حال تھا اور ان کی اصلاح تقریباً ناممکن تھی اسلام اور مسلمانوں کو ان لوگوں کی پیدا کردہ خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ عوام پر مولویوں، ملاؤں اور واعظوں کا اثر ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور اسی مقصد کے لیے سرسید نے پیری مریدی اور دینی اجارہ داری کے خلاف اپنی مہم چلائی۔

مسلمانوں میں اپنے مذہب سے محبت کرنے کا جذبہ بہت قوی اور شدید تھا۔ لیکن وہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے واقف نہ تھے۔ اور مذہب کے اصول سمجھ کر ایسے عقائد اختیار کر لیے تھے جو دینی، اخلاقی، اقتصادی، معاشری ہر قسم کی خرابیوں کا باعث بن گئے تھے۔ اور جن کی اصلاح کئے بغیر معاشرہ کے بگڑے ہوئے حالات کا درست ہونا ممکن نہ تھا۔ دین سے گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ دین کی صحیح تعلیمات سے ناواقفیت کی وجہ سے ایک ایسا مذہبی طبقہ عوام پر مسلط ہو گیا تھا جو خود بھی دین سے صحیح واقفیت نہ رکھتا تھا اور ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرہ میں بڑی تباہ کن خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان خرابیوں کو دور کر کے معاشرہ کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے لوگوں کے عقائد درست کرنے اور ان کو صحیح مذہب پر عمل کرانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ممکن نہ تھی اور سرسید نے اپنی اصلاحی کوششوں میں اس کا پوری طرح خیال رکھا۔

حوالے :-

[illegible] تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ صفحہ ۴۸۱

[illegible] مرتبہ امام الدین۔ تقریر لاہور۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۳۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد اوّل [illegible]

۴۔ ۵۔ ۶۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق [illegible]

۷۔ مکتوباتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ صفحہ ۲۲۵

۸۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۱۶۰

۹۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد پنجم۔ شمارۂ شوال ۱۲۹۱ھ

۱۰۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۹

۱۱۔ مکتوباتِ سرسید۔ صفحہ ۵۶۹

۱۲۔ خطوط سرسید۔ مرتبہ راس مسعود صفحہ ۵۵۔ ۱۳۔ ایضاً صفحہ ۷۴

۱۴۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۸۵

۱۵۔ نبیقہ در بیان مسئلہ تصوّر شیخ۔ از سید احمد خاں۔

۱۶۔ ماخوذ از کلمۃ الحق مصنّفہ سید احمد خاں مطبوعہ ۱۸۷۹ء

۱۷۔ حیات جاوید۔ صفحہ ۷۵۸۔

۱۸۔ راہِ سنت در ردِّ بدعت تصانیفِ احمدیہ جلد اوّل حصّہ اوّل مرتبہ سید احمد خاں ۱۳۰۰ھ

۱۹۔ خطوطِ سرسید۔ صفحہ ۷۴۔

۲۰۔ مکتوباتِ سرسید۔ صفحہ ۶۴۳۔

بیسواں باب

اخلاق و عادات کی اصلاح

معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے انفرادی اور اجتماعی اخلاق اور عادات کی اصلاح نہایت ضروری ہے اور سرسید نے اصلاحِ معاشرہ کے اس پہلو کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی کہ معاشری زندگی کے غلط تصورات اور اخلاقی کمزوریوں نے مسلمانوں میں جو خرابیاں پیدا کردی ہیں انکو دور کرکے ان میں ایسی خوبیاں پیدا کی جائیں جو ان کی فلاح و ترقی میں مدد دے سکیں اور وہ اپنے مفروضہ نظریات کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لے کر زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک ترقی پذیر معاشرہ تعمیر کریں۔

نقصان رساں عادتیں

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال نے ان کو نہ صرف حکومت و اقتدار سے محروم کردیا تھا بلکہ ان کی معاشری زندگی اور اقتصادی حالت پر بھی بہت برا اثر ڈالا تھا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ اور ان کا مستقبل نہایت تاریک تھا لیکن وہ اپنے موجودہ حالات اور آیندہ خطرات پر غور کرکے [illegible] پوری طرح متوجہ ہونے کے بجائے اپنی عظمتِ رفتہ کے تصور میں [illegible] حال و مستقبل سے آنکھیں بند کرکے صرف ماضی کے خواب [illegible] ماضی پرستی نے ان کو لکیر کا فقیر بنادیا تھا اور اجداد پہ

بے جا فخر نے ایسے غلط خیالات پیدا کر دیے تھے جو [illegible] بہت بڑی رکاوٹ بن گئے تھے۔ سرسید نے اس بات کی [illegible] کہ مسلمان اس طرزِ عمل سے باز آئیں اور حقیقت پسندی سے کام لے کر اپنی حالت درست کریں۔

ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی

مسلمانوں کی ماضی پرستی نے ان کو حال اور مستقبل سے غافل بنا دیا تھا۔ اور وہ اصلاح و ترقی کے لیے کوشش کرنے کے بجائے اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ ترقی کی تمام منزلیں طے کر کے درجۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اور اب ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ تمام علوم و فنون اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ان کے آبا و اجداد نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب ترقی کے لیے کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہی اس لیے وہ ہر نئی چیز سے گریز کرنے لگے اور ترقی پذیر زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے لکیر کے فقیر بنے رہنے کو سب سے بڑی ترقی سمجھنے لگے۔ سرسید نے ان کو اس تباہ کن رجحان کے خطرات سے آگاہ کر کے اس حقیقت کو واضح کیا کہ اپنے تئیں درجۂ کمال پر پہنچا ہوا سمجھنا ہی دراصل زوال کی نشانی ہے۔ جب کوئی شخص یا قوم کسی بات میں اپنے تئیں کامل سمجھ لیتی ہے تو اس میں سعی اور کوشش اور زیادہ تحقیقات اور نئی نئی باتوں کے ایجاد سے باز رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس چیز میں جس کو کامل سمجھا تھا زوال آ جاتا ہے۔ کسی شخص یا کسی قوم کو کسی چیز میں کامل سمجھ لینا بہت سی خرابیوں اور نقصانات کا باعث ہوتا ہے۔ جو چیز [illegible] میں کامل نہیں ہے ہم اس کو غلطی سے کامل سمجھ لیتے ہیں۔ کسی نئی بات [illegible] کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور اس کے فائدہ سے محروم رہتے ہیں [illegible] کے سننے کو گوارا نہیں کرتے اور اسی سبب سے [illegible] جہل مرکب میں پھنسے رہتے ہیں۔ ایسا کرنے [illegible]

[illegible] نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری اور ہماری آیندہ [illegible] طبع اور تیزیٔ ذہن اور طاقتِ انتقال ذہنی اور قوتِ [illegible] جاتی ہیں اور صرف اوروں کی ٹھکاری پر ہماری چال رہ جاتی ہے۔

قدامت پرستی اور نئی باتوں اور علوم و فنون سے گریز کے نقصانات بیان کرتے ہوئے سرسید نے یہ وضاحت کی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو قسم کی قومیں ہیں جن میں سے ایک نے اپنے باپ دادا کو درجۂ کمال پر پہنچا ہوا اور ناقابلِ سہو و خطا سمجھ کر ان کے علوم و فنون اور طریقِ معاشرت کو کامل سمجھا اور اس کی پیروی پر جمے رہے اور اس کی ترقی اور بہتری پر اور نئی چیزوں کے اخذ و ایجاد پر کچھ کوشش نہیں کی اور دوسری نے کسی کو کامل نہیں سمجھا اور ہمیشہ ترقی میں اور نئے نئے علوم و فنون و طریقۂ معاشرت کی ایجاد میں کوشش کرتی رہی۔ اور اب دیکھ لو کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے اور کون تنزّل اور کون ترقی کی حالت میں ہے۔ ہندو اور مسلمان وہ قومیں ہیں جو پچھلی لکیر کو کامل سمجھ کر اسی کو پیٹتے آئے ہیں۔ انگریز، فرنچ اور جرمن ایسی قومیں ہیں جو ہمیشہ ترقی کی کوشش میں ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ پہلی قومیں علم و ہنر اور تربیت و شائستگی میں اپنی ہم عصر قوموں سے مقدم اور اعلیٰ تھیں اور مسلمانوں کو یہ بھی عزّت تھی کہ وہ یورپ کی بعض قوموں کے لیے بمنزلہ اُستاد کے گنے جاتے تھے۔ مگر اسی عیب نے جو ان قوموں میں تھا اور اب بھی ہے اور اسی خوبی نے جو پچھلی قوموں میں تھی اور اب بھی ہے معاملہ بالکل برعکس کر دیا ہے۔ اب یورپ کی قومیں ایشیا کی قوموں سے علم و ہنر اور تربیت و شائستگی میں اعلیٰ ہیں۔ [illegible] ہماری قوم کو چاہیے کہ اپنے دماغ کو ان بیہودہ اور لغو خیالات سے جنھوں نے [illegible] سمجھ کو بالکل خراب کر رکھا ہے اور ان کی تمام خوبیوں کو خیالاتِ فاسد [illegible] کر دیا ہے خالی کریں۔ اور علوم اور فنون اور تہذیب و شائستگی [illegible] کریں۔

مسلمانوں میں یہ خرابی انتہا کو پہنچ گئی [illegible]
کرنے پر متوجہ کرنا سرسید کا مقصد تھا اس لیے [illegible]
مسلمانوں نے اپنے میں اس نقص کو نہایت درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ [illegible]
دنیوی اس سے ہم نے اٹھائے ہیں ان کی کچھ انتہا نہیں۔ دینی باتوں کو اس وقت
رہنے دو اور اس بات پر غور کرو کہ دنیوی علوم اور دنیوی کاروبار اور دنیا کی باہمی
معاشرت اور مجالست اور رسوم و عادات اور طریقۂ تعلیم و تربیت اور ترقی علم
مجلس میں کیوں ہم نہ کوشش کریں اور جس طرح اور قوموں نے ان باتوں میں ترقی
کی ہے ہم بھی اسی طرح کیوں نہ ترقی کریں۔ ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے
علوم اور اس کے فلسفہ اور اس کے الٰہیات کو ناقابل غلطی کے سمجھیں۔ بوعلی کچھ صاحب
وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں۔ جو علوم دنیوی ہم مدت دراز سے
پڑھتے آتے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ان ہی پر
پابند رہنے کے لیے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں۔
اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالےٰ کی عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور
جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں۔

"ان عمدہ اخلاق اور قواعد کو جو خدا تعالےٰ نے مذہب اسلام کی بدولت ہم کو
دئے تھے بُری طرح سے استعمال میں لانے اور ان کو بدصورت کر دینے سے غیر قومیں اسلام
کو ہماری نالائقی کی بدولت کیسی حقارت اور نفرت سے دیکھتی ہیں کیسے خندہ زن
اشارات اور کنایات اس پر کرتی ہیں۔ اور ہماری شامت اعمال کو نتیجہ مذہب
اسلام ٹھہراتی ہیں۔ ان کا ایسا کہنا اور خیال کرنا کچھ بے جا نہیں ہے۔ اسلام کوئی
مٹی کا پتلا نہیں ہے جس کو کوئی دیکھ سکے۔ مسلمانوں کی حالت [illegible]
سے اسلام کی صورت دکھائی دیتی ہے سو انھوں نے اس کو [illegible]
کہ جو کوئی نفرت کرے کچھ تعجب نہیں۔ پس اب [illegible]
اور تہذیب و شائستگی کی درستی میں کوشش [illegible]

[illegible] دنیا کو دکھا دیں۔"

[illegible] حال اور مستقبل سے غفلت اور بے تعلقی اور ماضی سے ضرورت سے زیادہ وابستگی نے مسلمانوں میں اجداد پر بے جا فخر کرنے کا [illegible] پیدا کر دیا تھا جو ان کی ترقی و اصلاح میں حائل تھا۔ قومی عظمت کی تاریخ ہر قوم کا قابل فخر سرمایہ ہوتی ہے اور وہ اپنے آباو اجداد کے کارناموں پر بجا طور سے فخر کر سکتی ہے۔ لیکن جب یہ فخر مناسب حدود سے گذر جاتا ہے اور کوئی قوم اپنی موجودہ خراب حالت کو درست کرنے کے بجائے اپنے آباو اجداد کی بڑائی کے محض اظہار کو کافی سمجھتی ہے تو اس کا یہ رجحان نقصان رساں بن جاتا ہے۔ اور اس کی زبوں حالی و بے حسی اصلاح و ترقی کی راہیں بند کر دیتی ہے۔ سرسید کے عہد میں ہندوستانی مسلمانوں کا یہی حال تھا۔ اسلئے اُنھوں نے یہ کوشش کی کہ مسلمان اپنے آباو اجداد پر بے جا فخر کرنے کے بجائے صحیح معنوں میں ان کے وارث بننے کی کوشش کریں اور ذلت و خواری کی اس حالت سے نکلیں جو ان کے آباو اجداد کے نام کو بھی بٹہ لگا رہی ہے۔ سرسید اس بات پر بہت متاسف تھے کہ "مسلمانوں کو جا بجا اپنی پہلی حالت پر غرور ہے اور خود پسندی اور استخوانِ جد فروشی ان کے دل میں مستحکم ہو گئی ہے۔" سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے بزرگوں کے حالات سے صحیح واقفیت حاصل کر کے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں۔ اور اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ موجودہ زوال و ادبار کی حالت میں پدرم سلطان بود کی رٹ لگائے جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس حالت کو بدل کر معزز و مقتدر بننے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی حالت کو درست کریں اور جو مواقع میسر ہو سکتے ہیں ان سے فائدہ اُٹھا کر [illegible] ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیں۔

[illegible] اس خیال کو عام کرنے کے لیے سرسید نے بڑے بڑے جلسوں [illegible] اس حقیقت کو واضح کیا کہ "ایسے وقت میں جب کہ مسلمان

نہایت بُری حالت میں ہیں ان کا اپنے باپ دادا کی [illegible]
حشمت پر ناز کرنا بڑی غلطی ہے۔ ایک نہایت مجرب کا بزرگ [illegible]
"دو چیز در دو چیز راست نیاید۔ ذکرِ تونگری در فقیری و ذکرِ جوانی در پیری"
ہمارے باپ دادا اگر بہت بڑے عالی قدر تھے اور ہم نہیں ہیں تو ہم کو اس پر ناز
نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ رونا چاہیئے کہ ہم اپنے بڑوں کا بھی نام ڈبونے والے پیدا
ہوئے۔"[4]

۱۸۸۳-۸۴ء میں سرسیّد نے پنجاب کا دورہ کیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو
جدید تعلیم کے حصول پر متوجہ کرنا تھا۔ اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے اس بات پر
بہت زور دیا کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ غیرت کرنی چاہیئے کہ وہ سب سے پیچھے
ہیں۔ اگر ان کو یہ خیال ہے کہ ان کے بزرگ بڑے معزز اور ممتاز تھے تو ان کو اور
بھی زیادہ غیرت کرنی لازم ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ کوشش کر کے اپنے ملک
میں ایسے عہدے حاصل کریں جن کے حاصل کرنے کا حق گورنمنٹ نے ان کو بخشا
ہے[5]۔ مسلمانوں کو اپنے بزرگوں پر فخر ہے۔ مگر بزرگوں کی باتیں یاد کر کے فخر کرنا
اور خود کچھ نہ ہونا محبت کے برخلاف ہے۔ بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے ان
بزرگوں کے نام کو بھی بٹہ لگانا ہے[6]۔

عزّت کا غلط تصوّر

مسلمانوں کے مقاصد اور طرزِ معاشرت میں ایک
بڑی خرابی یہ بھی تھی کہ ان کے خیال میں عزّت اور
ذلّت کا جو تصوّر تھا وہ بالکل غلط تھا۔ بہت سے ایسے کاموں کو جو ترقی و خوشحالی
کا ذریعہ تھے وہ ذلّت تصوّر کرتے تھے اور جھوٹی عزّت کے لیے سب کچھ قربان کر دینے
پر تیار رہتے تھے۔ ان کا عزّت و ذلّت کا یہ تصوّر محض رسم [illegible]
اور وہ جن نقصان رساں طریقوں اور رسموں کو عزّت کی علامت [illegible]
ان کو کسی حال میں بھی ترک کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ [illegible]
کے غلط تصوّر سے کس قدر نقصان پہنچتا ہے اور [illegible]

[illegible] نے اس خیال کو کمال دیں جو ان کی معاشری ترقی [illegible] ہے۔ انھوں نے اس بات پر بڑے افسوس کا اظہار [illegible] کے لوگوں نے عزت کے معنی سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ انھوں نے عزت کے مفہوم کو چند ظاہری باتوں پر منحصر سمجھ رکھا ہے۔ خانگی امور میں تو اپنی عزت انھوں نے اس میں سمجھ رکھی ہے کہ دو چار خدمت گار دست بستہ ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ حضور و عالی جناب کہہ کر اور ہاتھ جوڑ کر کچھ بات عرض کرتے ہیں۔ سواری کے جلو میں دو چار عصا بردار دوڑتے ہیں۔ دو تین خواص پان کا ڈبہ اور پیک تھوکنے کو پیک دان لیے حاضر ہیں۔ برادری میں اور اپنی قوم میں اپنی عزت اس میں سمجھ رکھی ہے کہ بیٹے کی بسم اللہ اور ختنہ کی شادی میں وہ کچھ کیا کہ آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کوئی دوست نہیں رہا جس کو نہ بلایا ہو۔ کوئی رقاصہ نہیں رہی جو مجرے کو نہ آئی ہو۔ بھانڈوں نے ایسا سماں باندھا کہ کسی کے ہاں نہ بندھا ہو۔ حاکموں کے دربار کی عزت اس میں منحصر ہے کہ صاحب ہم سے ہنس کر بولے۔ شاید دو چار قدم استقبال کیا۔ یہ تو نہایت خوش اور معزز کرسی پر بیٹھتے ہیں اور صاحب اس فکر میں ہیں کہ ان سے کیا بات کروں۔ کسی ملک کے حال سے یہ واقف نہیں۔ تاریخ کے دلچسپ واقعات کی ان کو خبر نہیں۔ انتظام ملکی اور انسان کی بھلائی و بہتری کے اصول تو ان کے خیال میں بھی نہیں گذرے۔ پھر میں بولوں تو کیا بولوں جیسے

سرسید نے اپنے زمانے میں عزت کے خواستگاروں کا جو یہ نقشہ کھینچا ہے وہ ان دو کے ذی اثر طبقہ کی ہو بہو تصویر ہے۔ سرسید نے عزت کے اس غلط [illegible] رسان تصور کو مٹانے کے لیے نہ صرف تحریر و تقریر سے کام لیا بلکہ عملی [illegible] جو لوگ صرف دولت کو عزت کا ذریعہ سمجھتے تھے ان کو [illegible] سے آگاہ کیا اور بتلایا کہ دولت حقیقی عزت حاصل [illegible] اپنی عزت پر یقین کرنے کے بجائے دوسروں سے اپنی

عزّت کے خواہاں ہوتے ہیں وہ اپنے مقصد کو کبھی نہیں [illegible]
عزّت سمجھنا اس لیے بڑی غلطی ہے کہ دولت کی وجہ سے جو [illegible]
اور جھوٹی تعریف کرنے اور جھوٹی عزّت دینے اور جھوٹی دوستی جتنے [illegible]
ہیں وہ اسی وقت تک رہتے ہیں جب تک کہ دولت رہتی ہے اور جب دولت
نہیں رہتی تو یہ لوگ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ محض دولت کو عزّت کا ذریعہ
سمجھنے والوں کو سرسید نے یہ بتلایا کہ "عزّت خود ایک صفت ہے جو مثل اور صفتوں
کے خود انسان کی ذات میں ہوتی ہے۔ سب سے پہلے خود انسان اپنے آپ کو معزز
سمجھتا ہے۔ اس عزّت کی بدولت اس کا دل نہایت قوی اور نہایت خوش رہتا
ہے۔ وہ مطلق اس بات کی خواہش نہیں رکھتا کہ کوئی دوسرا اس کی عزّت کرے۔
بلکہ اس کی خوشی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ خود ایسا ہو کہ آپ اپنی عزت پر یقین کرے۔
جب انسان ایسا ہو جاتا ہے تو تمام دنیا از خود اس کی عزّت کرتی ہے۔ وہ نہیں
چاہتا کہ لوگ میری عزّت کریں مگر بے اختیار دوست دشمن اس کے آگے جھکتے ہیں"۔

ظاہرداری

عزّت کے غلط تصوّر کی طرح ظاہر پرستی بھی ایک بُری عادت
تھی جس کو سرسید دور کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر پرستی کی
وجہ سے کس قدر فضول اور نامناسب باتیں مروّج تھیں اور ان سے کتنا نقصان ہوتا
تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے سرسید نے خط و کتابت کے طریقے کو مثال کے
طور پر پیش کیا ہے اور اس بُرائی کی اصلاح پر زور دیا ہے۔ چنانچہ اس عادت اور
رواج کی خرابیاں واضح کرنے کے لیے اُنھوں نے لکھا ہے کہ "جس طرح ہماری قوم میں
اور بہت سی فضول و نامناسب باتیں مروج ہیں اسی طرح خط و کتابت کے طریقے
میں بھی بہت سی لغویات شامل ہیں۔ جب ہم کسی خط کو پڑھتے ہیں تو اس میں ایک
بڑا لمبا چوڑا القاب و آداب پاتے ہیں۔ ان دونوں میں صرف [illegible]
وصفت مکتوب الیہ کے ہوتے ہیں جو درحقیقت [illegible]
امراء اور بادشاہ ہمیشہ اس خیال میں [illegible]

[illegible] وہ لوگ بھی اپنے تئیں ایسا ہی سمجھتے تھے۔ اور ہر قسم اور [illegible] اور بات چیت میں دونوں اس خیال کو کبھی بھولتے نہ تھے۔ اس محبت نے آپس کی تحریروں میں بھی وہ رسم جاری ہوئی جو خط و کتابت کے لیے زیبا نہیں ہے اور فضول و بے معنی وقت ضائع ہونے کے سوا آداب کے لفظوں کی رعایت سے دلی مطالب ادا نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد نہایت ذوق و شوق سے اشتیاقِ ملاقات لکھا جاتا ہے اور خلوص، عقیدت اور محبت جتائی جاتی ہے جس کا ایک لفظ بھی صحیح اور واقعی نہیں ہوتا۔ اس رسم نے ایسا رواج پایا ہے کہ دوست و دشمن دونوں کے خطوط کی طرزِ تحریر میں کچھ فرق و امتیاز نہیں رہا ہے۔ خط پڑھنے سے جو الفاظ محبت یا اشتیاق اس میں لکھے ہیں ان کا کچھ بھی اثر دل پر نہیں ہوتا بلکہ ایک معمولی تحریر سمجھی جاتی ہے جو دوست دشمن سب کو لکھی جاتی ہے اور خود پڑھنے والا جانتا ہے کہ میں بھی اس سے زیادہ چکنے چپڑے الفاظ لوگوں کو لکھتا ہوں جن کا کچھ بھی اثر میرے دل پر نہیں ہے۔

"ہماری قوم کے مقدس لوگوں نے ان دنیاوی تحریرات میں ایک اور مذہبی طرہ لگایا ہے۔ کوئی خط بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے خالی نہیں ہوتا۔ اور بہت سے بزرگ اپنے خطوط کے عنوان پر "مبسملاً، محمداً، حامداً، مصلیاً، مسلماً" لکھتے ہیں۔ اور لفافوں پر انشاء اللہ تعالےٰ تحریر فرماتے ہیں۔ افسوس ہے کہ لوگوں نے اسلام کے مقدس الفاظ و مضامین کو ایک دل لگی کی بات بنا لیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ نہایت دینداری اور خدا پرستی کا کام ہے۔ حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور اس کے مقدس الفاظ و مضامین کی بے ادبی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے ایسے خط بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حامداً و مصلیاً لکھے دیکھے ہیں جن میں تمام دنیاوی مزخرفات بھرے ہوئے ہیں۔ ان کاموں کے [illegible] مضامین مندرج ہیں جو ایماناً، اخلاقاً اور شرعاً ممنوع و حرام ہیں۔ [illegible] سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ جب مذہب کی مقدس [illegible] دیا جاتا ہے اور بطور مذہبی تقدس کے اس کو نہیں برتا

جاتا تو ان کی کچھ عظمت اور ان کا کچھ اثر دل میں نہیں رہتا [illegible]
مسلمان مذہب کو مذہب کی طرح نہیں برتتے بلکہ اس کا کھیل بنا [illegible]
یہ ہے کہ ہم کو شائستہ ہونا چاہیے۔ دنیا کے کاموں کو دنیا کی طرح اور دین کے کاموں کو
دین کی طرح برتنا چاہیئے۔ دونوں کو خلط ملط کر کے بگاڑنا اور مذہبی باتوں کو دنیاوی
باتوں میں گڈمڈ کر کے غیر مذہب والوں کو ہنسوانا نہیں چاہیئے۔ خط و کتابت اور
بات چیت میں جو ظاہرداری برتی جاتی تھی وہی معاشری زندگی کے دوسرے
شعبوں میں بھی موجود تھی۔ رہنے سہنے کے طریقوں میں یہ چیز زیادہ نمایاں تھی جس سے
معاشری اور اقتصادی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس لیے سرسید کی یہ کوشش تھی
کہ مسلمان ظاہرداری اور تکلفات میں پڑنے کے بجائے ایسے سیدھے سادے طریقے
اختیار کریں جو ان کی فلاح و ترقی کے لیے مفید اور کارآمد ہوں۔

کردار کو بگاڑنے والی خرابیاں

اچھائیوں اور برائیوں کو قبول یا رد کر دینے کی صلاحیت انسان میں
فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کی تعلیم اچھے طریقہ سے کی جاتی ہے تو اس میں
خوبیاں غالب ہو جاتی ہیں اور وہ برائیوں سے دور رہتی ہے اور اگر تعلیم و تربیت خراب
ہو تو اس میں طرح طرح کی انفرادی اور اجتماعی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ زوال پذیر قوم
کے حالات اس قدر ناسازگار ہو جاتے ہیں کہ اس میں اچھائیوں کے مقابلے میں
برائیاں زیادہ آسانی سے پھیل جاتی ہیں۔ اور ایسی قوم کی اصلاح کے لیے تمام افراد
کو اچھائیوں کی طرف مائل اور برائیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شدید جدوجہد کی ضرورت
ہے۔ کوئی قوم زوال پذیر اسی وقت ہوتی ہے جب اس میں خرابیاں [illegible]
اور اگر ایسی قوم کو سنبھالنے اور مزید خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے [illegible]
اختیار کی جائیں تو وہ بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ ہندوستان [illegible]
نے بھی ایسے ہی حالات پیدا کر دیئے تھے اور سرسید [illegible]

[illegible] خرابیوں کو روکنے اور خوبیوں کو ترقی دینے کی [illegible] حاصل کرنے کے لیے سرسید نے "تہذیب الاخلاق" جاری [illegible] بکثرت مضامین شائع کر کے انفرادی و اجتماعی برائیوں کے [illegible] اور خوبیوں کے فوائد سے آگاہ کیا۔

تعصب دینی، اخلاقی، معاشری ہر اعتبار سے تعصب ایک ایسی خصلت ہے کہ اگر اس کو مناسب حدود اور قابو میں نہ رکھا گیا تو بہت نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔ سرسید کے نزدیک تعصب انسان کی بدترین خصلتوں میں سے ہے۔ جو انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کر دیتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا۔ کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تعصب انسان کو ہر طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب کی وجہ سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔[1]

تعصب کی وجہ سے تمدن و معاشرت میں جو نقائص پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے یہ واضح کیا کہ انسان قواعدِ قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا [illegible] ہے۔ وہ تنہا اپنے حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور [illegible] کی دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب [illegible] تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے اور کسی کی دوستی [illegible] بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں، مائل نہیں ہوتا۔ [illegible] کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں

جو باتیں زیادہ منفعت اور زیادہ آرام اور [illegible]
کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے مگر متعصب ان سب [illegible] سے محروم [illegible]
ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت [illegible]
تک حاصل کرنا چاہیے۔ مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور
علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔ وہ ان تمام دلچسپ اور مفید
باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم اور فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض
جاہل اور ناواقف رہتا ہے۔ اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار
ہو جاتی ہے اور جو کچھ اس میں سمائی ہوئی ہے اس کے سوا کسی اور بات کے سمجھنے
کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہے
کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل
نہیں ہوتا۔

"بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق
میں اور کیا علم و ہنر میں۔ اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور
کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجۂ ذلت
اور خواری کو پہنچ گئی ہیں۔ اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ
اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ درجہ پر
پہنچ گئیں۔ مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب
کی بدخصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے
حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم دکھانے سے محروم اور ذلت
اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور [illegible]
خواہش ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم و فضل اور [illegible] کمال کے اعلیٰ
درجہ کی عزت تک پہنچیں۔"[11]

جو مسلمان مذہب کے معاملے میں تعصب [illegible]

[illegible] مذہب لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت کی نظر سے [illegible] کے نزدیک بہت غلطی پر ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ خیال ہے کہ [illegible] اور مذہبی علوم اور دنیا اور دُنیاوی علوم بالکل علاحدہ چیزیں ہیں۔ یہ بڑی نادانی ہے جو دُنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لائیں۔ اگر یہ خیال ہو کہ ان دُنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے، کیونکہ مذہبی مسائل ان دُنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں، تو نہایت افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم اور سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ منہا۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دُنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہلِ مذہب کے لیے ہو سکتی ہے۔ اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو، نہایت بُرا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔ غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے۔ اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے۔ اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے۔ مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سُنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعیہ پر مستعد ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے۔ برخلاف اس کے متعصب نادان دوست [illegible] ہوتا ہے۔ وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے [illegible] اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل [illegible] کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے۔ [illegible] کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے

کے بدلے اُلٹا اس کا مارج قوی ہوتا ہے [illegible]
نہیں ہیں بلکہ مخالفوں کی فتح یابی کی ہیں[۱۲]"

غرض کہ سرسید کے خیال میں تعصب [illegible] باتوں میں نہایت بُرا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال نہیں آتا۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔ علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دُنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصولِ معاش اور دنیاوی عزت اور تمول مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ تمام دُنیا کے انسانوں میں ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بُری خصلت ہے چھوڑنا چاہیئے۔ تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں اور سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے[۱۳]۔

انسان میں بُری عادتیں اور اخلاقی خرابی پیدا کرنے والا

بے جا مخالفت

ایک اور جذبہ بے جا مخالفت ہے جس سے اصلاح معاشرت میں خلل پڑ جاتا ہے۔ مہذب اور شائستہ آدمی کی مخالفت [illegible] نہیں ہوتی اور اس سے فائدہ بھی پہنچتا ہے لیکن نامہذب اور [illegible] مخالفت نقصان رساں ہوتی ہے۔ سرسید نے اپنی قوم کے ایک [illegible] کے جذبے کو بہت شدید پایا اور اس [illegible] حقیقت کا اظہار کیا کہ "مخالفت [illegible] مگر مہذب اور تربیت یافتہ [illegible]

[illegible] آدمیوں میں اس کا ظہور دوسری طرح پر [illegible] ہر قسم کے فائدے اُٹھاتا ہے۔ اور دوسرا ان فائدوں [illegible] ہے۔ اور دنیا میں اپنے تئیں بدطینت اور نامہذب ثابت کرتا [illegible] بات قریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر گو وہ کیسی ہی [illegible] اور سچ ہو متفق ہو جائیں۔ پس ضرور ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ ایک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اس کو چُن لوں۔ اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں۔ اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے اور ان غلطیوں کو اس طرح پر بتاتا ہے جیسے ایک دل سوز دوست بتاتا ہے۔ اور باوجود مخالفت کے اس سے ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن بدطینت، نامہذّب اور ناشائستہ آدمی یہ راستہ نہیں چلتا۔ وہ بات کے حُسن و قبح کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے مخالف کے عیوبِ ذاتی سے بحث کرنے لگتا ہے۔ سخت کلامی و زشت گوئی اور سب و شتم اپنا پیشہ کر لیتا ہے۔ اپنے مخالف کے عیوبِ واقعی ہی کے بیان پر بس نہیں کرتا بلکہ ہر قسم کے بہتان اس پر لگاتا ہے اور جھوٹی باتیں اس کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس راہ چلنے سے اور جھوٹ اتہام کرنے سے اس کا مطلب اپنے مخالف کو بدنام کرنا اور عام لوگوں میں جو اس کے مخالف کے حال سے واقف نہیں ہیں ناراضی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت اس کا یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ اور [illegible] اس کے کہ اس کا مخالف بدنام ہو خود ہی زیادہ رُسوا اور بدنام ہوتا ہے۔ [illegible] اس مخالف کی بُرائی جو اس نے براہِ کذب و اتہام اس کی نسبت [illegible] ہوتی ہے تو کوئی تو اس کو سچ سمجھتا ہے اور بہت لوگ [illegible] ہوتے ہیں۔ اور جب اس کی کچھ اصل نہیں پاتے تو بعض [illegible] پر لعنت اور تھو تھو کرتے ہیں۔ دروغ کو فروغ

نہیں ہوتا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اس کی قلعی کھل جاتی [illegible]
خود اسی گڑھے میں گرتا ہے جو اس نے اپنے مخالف کے لیے [illegible]
کو چاہیے کہ اپنے مخالف سے بھی مخالفت کرنے میں سچائی اور راست بازی [illegible]
نیک دلی کو کام میں لائے کہ یہی طریقہ اپنے مخالف پر فتح پانے کا ہے۔ ورنہ
بعوض اپنے مخالف کے خود اپنے تئیں آپ رسوا کرتا ہے۔"[۱۴]

خوشامد پسندی اخلاق و کردار پر اثر ڈالنے اور معاشرہ کو نقصان پہنچانے والی ایک اور بری شے خوشامد اور خوشامد پسندی ہے اور یہ عادتیں جن لوگوں میں ہوتی ہیں وہ معاشرہ میں خرابیاں پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ سرسید کے زمانے میں یہ برائی بہت پھیل رہی تھی اور اس کی روک تھام کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں پر یہ واضح کیا کہ دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔ جس وقت کہ انسان کے بدن میں ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو وبائی ہوا کے اثر کو جلد قبول کر لیتا ہے تو اس وقت انسان مہلک مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کہ خوشامد کے اچھا لگنے کی بیماری انسان کو لگ جاتی ہے تو اس کے دل میں ایک ایسا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیشہ زہریلی باتوں کے زہر کو چوس لینے کی خواہش رکھتا ہے۔ اوّل اوّل یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی آپ خوشامد کرتے ہیں اور اپنی ہر ایک چیز کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور آپ ہی آپ اپنی خوشامد کر کے اپنے دل کو خوش کرتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اوروں کی خوشامد ہم میں اثر کرنے لگتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوّل تو خود ہم کو اپنی محبت پیدا ہوتی ہے پھر یہی محبت و مہربانی جو خود اپنے ساتھ کرتے تھے وہ ہم خوشامدیوں کے ساتھ کرنے لگتے ہیں۔ یہی محبت ہم کو بتلاتی ہے کہ ان خوشامدیوں [illegible] مہربانی کرنا نہایت حق اور انصاف ہے جو ہماری باتوں کو [illegible]
اس قدر قدر کرتے ہیں۔ جب ہمارا دل [illegible]

[illegible] جاتا ہے تو ہماری عقل خوشامدیوں کے مکر و فریب سے [illegible] اور وہ مکر و فریب ہماری بیمار طبیعت پر بالکل غالب [illegible]

جب ہم کو کسی ایسے وصف کا شوق پیدا ہوتا ہے جو ہم میں نہیں ہے یا ہم ایسے بننا چاہتے ہیں جیسے کہ درحقیقت ہم نہیں ہیں تب ہم اپنے تئیں خوشامدیوں کے حوالے کرتے ہیں۔ اور جو اوروں کے اوصاف اور اوروں کی خوبیاں ہم میں لگانے لگتے ہیں۔ گو بسبب اس کمینہ شوق کے اس خوشامدی کی باتیں ہم کو اچھی لگتی ہوں مگر درحقیقت وہ ہم کو ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے کہ دوسروں کے کپڑے جو ہمارے بدن پر کسی طرح ٹھیک نہیں۔ اگر ہر شخص کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ خوشامد کا شوق کیسے نالائق اور کمینہ سببوں سے پیدا ہوتا ہے تو خوشامد کی خواہش کرنے والا شخص بھی یقینی ویسا ہی نالائق اور کمینہ متصور ہونے لگے گا۔ اس بات سے کہ ہم اپنی حقیقت کو چھوڑ کر دوسرے کے اوصاف اپنے میں پیدا کریں اور بعوض جھوٹی نقل بننے کے خود ایک اچھی اصل ہو جاویں۔[۱۵]

بحث و تکرار کی عادت

انسانوں میں اختلاف رائے ہونا ایک لازمی بات ہے اور بحث مباحثہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی رائے کس حد تک درست ہے لیکن تہذیب اور شائستگی کا تقاضا یہ ہے کہ مباحثہ میں خوش اخلاقی، شرافت اور انسانیت کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔ ورنہ تہذیب و اخلاق کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے جو مباحثہ کیا جاتا ہے اور بحث و تکرار کی جو صورت پیدا ہو جاتی ہے وہ انسانوں کو حیوانیت سے قریب کر دیتی ہے۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کی حالت کس قدر پست ہے۔ بحث و تکرار کی اس صورت کو جو ناشائستہ لوگوں میں [illegible] بہت ہی شرمناک اور کتوں کی خصلت قرار دیتے تھے اور [illegible] تہذیب کے لیے اس برائی کو ختم کرنا لازمی سمجھتے تھے۔ اس

بحث و تکرار کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور اس کا آغاز [illegible]
نقشہ سرسید نے اس طرح کھینچا ہے کہ نامہذب آدمیوں کی [illegible]
سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع [illegible]
ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے
واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری
چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں چر جاتی
ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک کف بھر
آتا ہے۔ سانس جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ،
عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستینیں
چڑھا، ہاتھ پھیلا۔ اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی
مٹھی میں۔ لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو غراتے
ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک ادھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو
کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔[۱۲۶]

بحث و تکرار کے اس غیر مہذب اور وحشیانہ طریقے کو ختم کرنے کے لیے
سرسید نے اپنے ہموطنوں کو بتلایا کہ انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور
اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے۔ مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں
تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔ جب تم کسی کے
برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور
تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو
اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح [illegible]
تہذیب اور شرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جائے۔ [illegible]
ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو [illegible]
ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو بنیاد [illegible]

[illegible] کو کچھ ہنسی خوشی اور دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔[۱۷]

کردار کو بنانے والی خوبیاں

معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے دینی، اخلاقی، معاشری ہر قسم کی برائیوں کو ختم کرنے کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ سرسید نے لوگوں میں کچھ ایسی خوبیاں پیدا کرنے کی بھی کوشش کی جو اخلاق و کردار کی تعمیر اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے ضروری اور مفید ہیں۔ اور جن کی بدولت ایسے ذاتی اوصاف پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے جو اجتماعی فلاح و ترقی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ زوال پذیر قوم کی حالت کو بدلنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ برائیوں کو چھوڑا اور اچھائیوں کو اپنایا جائے۔ سرسید نے بھی معاشری اصلاح کے ان دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا اور برائیاں چھوڑنے اور خوبیاں اختیار کرنے کی ترغیب دی۔

آزادیٔ رائے جو قوم صحیح طور سے غور و فکر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور آزادی کے ساتھ اپنے خیالات اور رائے ظاہر کرنے کے حق سے محروم ہوتی ہے اس کی حالت بہت پست ہو جاتی ہے اور اس کی یہ محرومی راہِ ترقی میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں حکومت، رسم و رواج اور مذہب تین ایسی بڑی طاقتیں ہوتی ہیں جو اظہارِ خیال کی آزادی پر پابندیاں لگا دیتی ہیں۔ سرسید کے زمانے میں یہ تینوں طاقتیں معاشرہ پر پوری طرح حاوی تھیں اور ان کی عائد کردہ پابندیوں اور جہالت نے غور و فکر [illegible] اظہارِ خیال کی آزادی سے محروم کر دیا تھا۔ سرسید کی یہ کوشش تھی کہ آزادیٔ [illegible] کی ضرورت و اہمیت کو لوگ محسوس کریں اور نئے خیالات سے استفادہ [illegible] حالت کو بہتر بنائیں چنانچہ انہوں نے لوگوں کو یہ بتلایا کہ "رائے کی [illegible] یہ ہے کہ ہر ایک انسان اس پر پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اور [illegible] کسی ذاتی نفع کے اور خواہ بہ سبب اندیشۂ برادری

وقوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے [illegible]
چیز ہے۔ مخالف اور موافق رایوں کا پھیلنا اور منتشر ہونا خواہ وہ دینی معاملے سے
علاقہ رکھتی ہوں یا دنیاوی معاملہ سے نہایت عمدہ اور مفید ہے۔ دونوں قسم کی
رایوں پر جدا جدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ ان میں سے کون سی بہتر ہے یا
ان دونوں کی تائید ایسے دلائل سے ہوتی ہے جو جداگانہ ہر ایک کے مناسب
ہیں۔ ہم کو اس بات کا کبھی یقین کامل نہیں ہو سکتا کہ جس رائے کی مزاحمت میں
ہم کوشش کرتے ہیں وہ غلط ہی ہے۔ اور اگر یقین بھی ہو کہ وہ غلط ہے تو بھی
اس کی مزاحمت اور اس کا انسداد برائی سے خالی نہیں۔ رائے کے بند کرنے
والے ایسے نہیں جن سے غلطی اور خطا ہونی ممکن نہ ہو۔ پھر ان کو اس بات کا حق
نہیں کہ وہ ایک خاص معاملہ کو تمام انسانوں کے لیے خود فیصل کریں اور
شخصوں کو اپنی رائے کام میں لانے سے محروم کر دیں جس شرط سے ہم بطور
جائز اپنی رائے کو عملدرآمد ہونے کے لیے درست قرار دے سکتے ہیں وہ صرف
یہی ہے کہ لوگوں کو اس بات کی کامل آزادی ہو کہ وہ اس رائے کے برخلاف
کہیں اور اس کو غلط ثابت کریں۔

"انسان اپنی غلطیوں کو مباحثہ اور تجربہ کے ذریعہ سے درست کر لینے کی
قابلیت رکھتا ہے۔ پس انسان کی رائے کی قدر و منزلت کا انحصار اسی ایک
بات پر ہے کہ جب وہ غلط ہو تو صحیح کی جا سکتی ہے۔ اور اس پر اعتماد اسی وقت
کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کے صحیح کرنے کے ذریعے ہمیشہ برتاؤ میں رکھے
جائیں۔ جس طریقہ سے انسان کسی معاملہ کے کل مدارج کو جان سکتا ہے
صرف یہ ہے کہ اس کی بات ہر قسم کی رائے کے لوگوں کی [illegible] اور
جن جن طریقوں سے ہر سمجھ اور ہر طریقہ اور طبیعت کے آدمی [illegible]
نظر کریں ان سب طریقوں کو سوچے [illegible]
بھروسہ کرنے کی خواہش ہو [illegible]

[illegible] کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو عام مباحثہ اور [illegible] کے اعتراض کے لیے حاضر کرے۔ بغیر آزادیٔ رائے کے کسی چیز کی سچائی جہاں تک کہ اس کی سچائی دریافت ہونی ممکن ہے، دریافت نہیں ہو سکتی۔ ہر ایک شخص کو گو اس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بیباکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مُردہ اور مردار رائے قرار دی جائے گی نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت۔ اور وہ کبھی ایسی حق اور سچی بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے۔[1]

قلبی اور عقلی قوت سے کام لینا

کاہلی ایک ایسی بُری عادت ہے جو انسان کی صلاحیتوں کو بیکار کر دیتی ہے اور معاشرہ کی ترقی و خوش حالی کے لیے اس عادت کو ختم کرنا ضروری ہے۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت نہ کرنا، کام کاج اور محنت مزدوری میں چُستی نہ کرنا اور اُٹھنے، بیٹھنے، چلنے، پھرنے میں سُستی کرنا کاہلی ہے۔ لیکن سرسید کاہلی کی ایک اور قسم بھی قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک دل کے قویٰ کو بیکار چھوڑ دینا یعنی ذہنی اور عقلی قوت سے کام نہ لینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ وہ اس کو افراد اور معاشرہ کے لیے بہت نقصان رساں تصوّر کرتے تھے اور معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے اس عادت کو چھڑانا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہاتھ پاؤں کی محنت سے اوقات بسر کرنے اور روٹی کما کر کھانے کے لیے نہایت ضروری ہے اور روٹی پیدا کرنا اور [illegible] ایسی چیز ہے کہ بہ مجبوری اس کے لیے محنت کی جاتی ہے اور ہاتھ [illegible] جاتی ہے۔ اور اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ محنت مزدوری [illegible] روزانہ محنت سے اپنے بسر اوقات کا سامان مہیّا

کرتے ہیں بہت کم کاہل ہوتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو ان باتوں کی [illegible]
ہے وہ اپنے دلی قوے کو بیکار چھوڑ کر بڑے کاہل اور بالکل حیوان صفت ہو جاتے
ہیں۔ انسان بھی مثل اور حیوانوں کے ایک حیوان ہے اور جب کہ اس کے دلی قوے
کی تحریک سست ہو جاتی ہے اور کام میں نہیں آتی تو وہ اپنی حیوانی خصلت میں
پڑ جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی آمدنی اس کے اخراجات کو مناسب ہو اور
اس کو حاصل کرنے میں اس کو چنداں محنت و مشقت کرنی نہ پڑے اور وہ اپنے
دلی قویٰ کو بھی بیکار ڈال دے تو اس کا حال کیا ہوگا۔ یہی کہ اس کے عام شوق
وحشیانہ باتوں کی طرف مائل ہوتے جائیں گے۔ شراب پینا اور مزیدار کھانا اس کو
پسند ہوگا اور قمار بازی اور تماش بینی کا عادی ہوگا۔

"ہم قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے ایسے کام بہت کم
ہیں جن میں ان کو قوائے دلی اور قوتِ عقلی کو کام میں لانے کا موقع ملے۔ مگر اس کا
بھی سبب یہی ہے کہ ہم نے کاہلی اختیار کی ہے۔ یعنی اپنے دلی قویٰ کو بیکار چھوڑ دیا
ہے۔ اگر ہم کو قوائے قلبی اور قوتِ عقلی کے کام میں لانے کا موقع نہیں ہے تو ہم کو
اس کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ موقع کیوں کر حاصل ہو۔ اگر اس کے
حاصل کرنے میں ہمارا کچھ قصور ہے تو اس کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے کہ وہ قصور
کیوں کر رفع ہو۔ غرض کہ کسی شخص کے دل کو بیکار پڑا رہنا نہ چاہیے۔ کسی نہ کسی
بات کی فکر و کوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات
کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی
دل کو بیکار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک ہم کو اپنی قوم کی بہتری کی
توقع نہیں ہے۔"

اخلاق و عادات کی درستی اور معاشرے کی اصلاح

اپنے اعمال کا محاسبہ کے لیے سرسید کی ضروری خدمات

ہر شخص اپنے اعمال کا محاسبہ کرے اور [illegible]

[illegible] ہوتے ہیں جن کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہوتا ہے۔ چنانچہ دنیا دار [illegible] جس قدر کہ دراصل وہ بد ہیں اس سے زیادہ اپنے تئیں بد بناتے ہیں اور دینداری کی بناوٹ کرنے والے جس قدر کہ ہوتے ہیں اس سے زیادہ نیک اپنے آپ کو جتلاتے ہیں۔ مگر ایک اور تیسری قسم کے لوگ ہیں جو ان دونوں قسموں سے علاحدہ ہیں۔ ان کی بناوٹ کچھ اور ہی قسم کی ہے اور وہ اپنی بناوٹ سے اکثر خود آپ بھی دھوکہ میں پڑتے ہیں۔ وہ بناوٹ خود ان سے انھیں کے دل کے حال کو چھپاتی ہے اور جس قدر کہ درحقیقت وہ نیک ہیں اس سے زیادہ ان کو نیک جتاتی ہے۔ پھر تو وہ لوگ یا اپنی بدیوں پر خیال ہی نہیں کرتے یا ان بدیوں کو نیکیاں سمجھتے ہیں۔

اس برائی سے بچنے یا اس کو دور کرنے کے لیے سرسید نے چند طریقے بتلائے ہیں جن میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو ان مذہبی اصولوں سے جو ہماری ہدایت کے لیے کتاب اللہ میں لکھے ہیں جانچیں۔ اور اپنی زندگی کو رسولِ پاکؐ کی زندگی سے مقابلہ کریں جو اپنی پیروی کرنے والوں کے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے بڑے ہادی اور بہت بڑے دانا اُستاد ہیں۔ اس طریقہ کے علاوہ سرسید نے پوشیدہ عیبوں کے معلوم کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کے جو قاعدے بتلائے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دشمن ہم کو کیا کہتے ہیں۔ ہمارے دوست اکثر ہمارے دل کے موافق ہماری تعریف کرتے ہیں۔ یا تو ہمارے عیب ان کو عیب ہی نہیں معلوم ہوتے اور یا وہ ہماری خاطر کو ایسا عزیز رکھتے ہیں کہ اس کو رنجیدہ نہ کرنے کے خیال سے ان کو چھپاتے ہیں۔ یا ایسی نرمی سے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نہایت ہی خفیف سمجھتے ہیں۔ برخلاف اس کے دشمن ہم کو خوب ٹٹولتا ہے اور کونے کونے سے ڈھونڈ کر ہمارے [illegible] ہمیشہ اپنے دوست کی نیکیوں کو بڑھاتا ہے اور [illegible] اس کے لحاظوں کے سبب عیبوں کو چھوڑ دیا تو

دشمن سے ہم کو وہی نتیجہ ملا جو ایک شفیق استاد سے ملنا چاہیے
صحیح یا غلط ہم میں لگاتا ہے ہمارے فائدہ سے خالی نہیں۔ اگر وہ ہم میں ہے
تو ہم اپنے عیب سے مطلع ہوتے ہیں۔ اور اگر نہیں ہوتا تو خدا کا شکر کرتے
ہیں کہ وہ عیب ہم میں نہیں۔

سرسید نے ذاتی محاسبے کے دوسرے طریقے یہ بتلائے ہیں کہ اگر ہم خود
اپنے آپ کو سمجھنا چاہیں کہ ہم کیا ہیں تو ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جو لوگ
ہماری تعریف کرتے ہیں ان میں سے ہم کس قدر کے مستحق ہیں۔ اور جن کاموں
کے سبب سے وہ تعریف کرتے ہیں وہ کام ہم عمدہ غرض سے اور نیک نیتی سے دنیا کو
فائدہ پہنچانے کے لیے کرتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ نیکیاں
جن کے سبب ہماری تعریف کرنے والے ہماری تعریف کرتے ہیں در اصل
ہم میں کہاں تک ہیں ہم کو ایسی نیکی پر بھی جس کو ہم نے اپنے خیال میں نیک
سمجھا ہے مگر درحقیقت اس کی نیکی مشتبہ ہے زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہیے بلکہ ان
لوگوں کی رایوں کی بھی نہایت قدر و منزلت کرنی چاہیے جو نیک دلی سے
ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اختلاف کرنے والوں نے
صرف آزادیٔ رائے اور دلی نیکی سے اختلاف کیا ہے یا کسی بیرونی دباؤ یا
پابندیٔ رسم و رواج اور تعصب اور تقلید نے ان کے دل کو پھیرا ہے۔ کیونکہ اگر
یہ پچھلی بات اختلاف رائے کا سبب ہو تو وہ نہایت بے قدر ہو جاتی ہے۔
جہاں ہم کو دھوکہ کھانے کا احتمال ہے وہاں ہم کو نہایت ہوشیاری اور
بہت خبرداری سے کام کرنا چاہیے۔ تعصب اور کسی خاص مذہب کے لوگوں کو
بُرا اور حقیر سمجھنا ایسی باتیں ہیں جن سے ہزاروں آفتیں [illegible]

رجائیت پسندی

مایوسی اور قنوطیت [illegible]
عملی قوتیں [illegible]
مسدود ہو جاتی ہیں اور [illegible]

سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کو جن مصائب و مشکلات اور [illegible] کا سامنا کرنا پڑا ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اپنی بہتری اور اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اور ان کے مصائب میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا وہ اُمیدوں کے سہارے سے بھی محروم ہوتے گئے۔ اس مایوسی اور نومیدی نے ان کی معاشری حالت پر بھی بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ اور ان کی حالت کو درست کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ ان کے دلوں سے مایوسی اور نومیدی کو دور کر کے ان میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ تمام مشکلات کے باوجود وہ پھر اپنی حالت کو بہتر بنا سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں۔ سرسید نے ترقی و اصلاح کے اس تقاضے کو محسوس کیا اور نومیدی کی تاریکی دور کرنے کے لیے اُمید کی شمع روشن کرنے کا احساس بیدار کیا۔

سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان یاس اور قنوطیت کے بجائے آس اور رجائیت کے سہارے آگے بڑھیں اور اپنے بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے اور بہتر بنانے کی جد و جہد کریں۔ اور اس مقصد کے پیش نظر اُنھوں نے یہ بتلایا کہ اُمید کتنی بڑی طاقت ہے اور اس کے سہارے انسان حالات کو کس طرح بدل دیتا ہے جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو ہمارے دل کے مشغلہ کو بلا لاتی ہے، اسی طرح ایک اور قوت ہے جو آیندہ ہونے والی باتوں کے خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے۔ اور اس کا نام اُمید یا رجا ہے۔ ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی اُمید نہ ہو سکے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو وہ ہم کو دے نہ سکے۔ سچ یہ ہے کہ زندگی کی اُمید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی اُمید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔ زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی۔ اُمید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ اُمید ہی کے سبب سے انسان میں سنجیدگی اور [illegible] خوش مزاجی کی عادت ہو جاتی ہے۔ گویا اُمید انسان کی روح کی

جان ہے۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے محنت پر رغبت دلاتی ہے۔ اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔ اور ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا ہے۔

سرسید نے یہ بتلایا کہ اُمید بہت بڑی طاقت ہے جو بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ مصیبت کے وقتوں میں تسلّی دیتی ہے۔ آڑے وقتوں میں مدد کرتی ہے۔ حضرت آدم جب شیطان کے پنجے میں پھنس گئے، اور تمام نیکیوں نے ان کو چھوڑ دیا تو اُمید ان کے ساتھ رہی اور اس نے ان کو پھر اعلیٰ درجہ پر پہنچایا۔ بیٹے کی جُدائی کے غم میں حضرت یعقوب کی آنکھیں روتے روتے سفید ہوگئیں اور کوئی خوشی ان کے ساتھ نہیں رہی لیکن اُمید نے ان کو زندہ اور بیٹے سے ملنے کی آس نے مطمئن رکھا۔ اور جب حضرت یوسف کو اندھیرے کنویں اور سات تہ خانوں میں بند کیا گیا اور مصائب نے ان کو نڈھال کر دیا تو اُمید نے ان کو سہارا دیا اور ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی۔ گردشِ زمانہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور ان کی بھلائی کی فکر کرنے اور ان کی بہتری کی تدبیریں ڈھونڈنے والوں کے لیے بھی اُمید باعثِ تقویت ہے۔ جو دل کی تسلّی اور کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔

اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ سرسید نے معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے اپنی قوم میں جو ایک اور بڑی خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی وہ اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ ہے۔ دوسری مشرقی اقوام کی طرح ہندوستانی بھی اس بات کے عادی تھے کہ ان کی فلاح و بہبود کے لیے جن کاموں کی بھی ضرورت ہے وہ حکومت ہی کرے۔ اور ان کا یہ رجحان قومی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ تھا۔ سرسید نے اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے اس بات کو واضح کیا کہ ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش [illegible] اور جب کہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جائے [illegible]

[illegible] کی جڑ ہے۔ ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ [illegible] کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر چکے تھے یہ سمجھتے تھے کہ ایک عمدہ انتظام قوم کی عزت و بھلائی اور خوشی و ترقی کا ذریعہ ہے۔ عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قویٰ کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔ اور جس قدر گورنمنٹ عمدہ ہوتی ہے اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے۔ مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار، اور شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا۔ بلکہ یہ باتیں شخصی محنت، کفایت شعاری اور نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہے نہ کہ گورنمنٹ میں بڑے بڑے حقوق اور اعلیٰ درجہ حاصل کرنے سے۔

گورنمنٹ عموماً ان لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو رنگ ان کا ہوتا ہے وہی گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادات، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے۔ اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جن سے وہ قوم بنی ہے۔ قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل بھی مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی اور شخصی برائیوں کا۔ پس قوم کی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ اور غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی [illegible] چال چلن کس طرح عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم ہو جب کہ ہر شخص اور [illegible] اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات [illegible] کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے، [illegible] بات ہے وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو

ایک ناخدا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا [illegible]
خود مختار بادشاہ کی رعیت ہے، بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو [illegible]
خود غرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی
ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زنجیروں
یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں، جب تک کہ غلامی
کی یہ حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ
ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور
جرتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کوئی خضر ملے۔ گورنمنٹ
فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے
کی جائے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا
جائے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے۔ بڑا سچا اور نہایت مضبوط
مسئلہ جس سے دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔
جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لائیں گے تو پھر خضر کو
ڈھونڈنا بھول جائیں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں
اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد
کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔[۲۲]

سرسید جب انگلستان گئے اور یہ دیکھا کہ اس ملک کے باشندے قومی
کاموں میں کس قدر حصہ لیتے ہیں اور ان کی حیرت انگیز ترقی بھی انفرادی جد
جہد کا نتیجہ ہے تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنے سفرنامہ میں سرسید نے
ایسے متعدد واقعات بیان کیے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible]
کی خوبیوں اور ترقیوں سے کس قدر متاثر [illegible]
کو کس قدر خراب حالت میں پاتے [illegible]

[illegible] انجام دینا شاید ایک بادشاہ کی قوت سے خارج تھا [illegible] سخاوت اور علم و ہنر سے انجام پایا ہے۔ اور اس خیال [illegible] قوم کی عزت اور قدر و منزلت اور عظمت و شوکت ان کے دل [illegible] ہے اور وہ اپنی قوم سے پوچھتے ہیں کہ "یہ لوگ آدمی ہیں یا ہم جو صرف حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضی میں مبتلا ہیں۔ اور پھر "صاحب ہمت" ایسے ہیں کہ ہر ایک کام میں کہتے ہیں کہ گورنمنٹ بندوبست کردے۔ لڑکیوں کے پڑھانے کا بھی گورنمنٹ بندوبست کرے۔ لڑکوں کے پڑھانے کا بندوبست گورنمنٹ کرے۔ ان کو ان کا مذہب سکھانے کا بھی گورنمنٹ ہی بندوبست کرے۔ افسوس، صد افسوس، ہزار افسوس! حقیقت میں ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کسی تربیت یافتہ ملک کے لوگوں کو اپنا منہ بھی دکھلا سکیں[۲۳]۔"

اخلاق و کردار کی تعمیر اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک طرف تو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کو بُری خصلتوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور کر دی جائیں اور دوسری طرف یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ قوم کو اچھی خصلتیں اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے۔ اگر اصلاح اور ترقی کے ان دونوں پہلوؤں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ سرسیّد کے عہد میں ہندوستان اپنی تاریخ کے ایک نازک ترین دور سے گذر رہا تھا۔ اور پورے معاشرہ کی اخلاقی حالت نہایت پست ہو گئی تھی۔ چنانچہ سرسید نے جب لوگوں کی عادتیں درست کرنے، اخلاق کو سنوارنے اور معاشرہ کی خرابیاں دور کرنے کا کام شروع کیا تو معاشری اصلاح کے ان پہلوؤں کا بھی پورا خیال رکھا۔

[illegible]

[illegible] اخلاق - جلد اوّل - شمارہ شوال ۱۲۸۷ھ

۴۔ سید احمد خاں کے لکچرز و اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین [illegible]

۵۔ سفرنامۂ پنجاب (سید احمد خاں) مرتبہ سید اقبال علی [illegible]

۶۔ سفرنامۂ پنجاب۔ تقریر گورداسپور۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۷۔۸۔ سید احمد خاں کے لکچرز و اسپیچز۔ تقریر پٹنہ۔ مئی ۱۸۷۳ء

۹۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ صفحہ ۱۴۲۔

۱۰ تا ۱۳۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد اوّل۔ شمارۂ شوال ۱۲۸۷ھ

۱۴۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۹۸

۱۵۔ " " " صفحہ ۱۰۰

۱۶۔۱۷۔ مجلہ تہذیب الاخلاق جلد چہارم۔ شمارہ صفر ۱۲۹۰ھ

۱۸۔ مقالاتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی جلد پنجم۔ صفحہ ۲۱۳

۱۹۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد سوم۔ شمارۂ محرم ۱۲۸۹ھ

۲۰۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۹۴

۲۱۔ " " " صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۱

۲۲۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد ششم۔ شعبان ۱۲۹۲ھ

۲۳۔ مسافرانِ لندن۔ (سفرنامہ سید احمد خاں) شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۴ء

چھٹا باب

رسوم و رواج میں مفید ترمیم

ہندوستان میں جو معاشری خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان میں رسوم و رواج کا بھی بڑا دخل تھا۔ بعض رسمیں اور طریقے تو ایسے تھے کہ ان کا اثر طرزِ معاشرت اور تہذیب و شائستگی تک محدود تھا۔ لیکن بہت سی رسمیں اور رواج قومی ترقی میں حائل تھے، معاشی حالت کو بگاڑ دیتے تھے۔ اور اخلاق و کردار پر بُرا اثر ڈالتے تھے۔ مسلمان ایسی رسموں اور رواج کے پابند ہوگئے تھے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کی نہ صرف معاشری و اقتصادی بلکہ دینی زندگی میں بھی بڑی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ اور ہندوؤں میں تو بعض ایسے طریقے بھی رائج تھے جو انسانیت اور معاشرہ کے خلاف بدترین جرائم تھے۔ اور جن کے اثرات نے پورے معاشرہ میں بڑی تباہ کُن خرابیاں پیدا کر دی تھیں۔ ہندوؤں کے ان طریقوں میں ستی اور دختر کُشی جیسی انسانیت سوز رسمیں بھی شامل تھیں جن کو مٹانے کے لیے انگریزی حکومت کو قانون بنانا اور تشدّد اور طاقت سے کام لینا پڑا لیکن اس کے باوجود ان کو ختم کرنے میں بڑی مدّت لگی۔ اور دوسری [illegible] بھی اس کے بُرے اثرات پڑے۔

[illegible] سید اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ جب تک بُری رسموں اور [illegible] کا جائے گا معاشری اصلاح اور قومی ترقی کے مقصد میں کامیابی [illegible] نے نقصان رساں رسوم و رواج کے خلاف مؤثر جدوجہد

شروع کر دی۔ لوگوں کو یہ بتلایا کہ رسوم و رواج کی ابتدا کیوں کر ہوتی ہے۔ اچھی رسموں میں بھی خرابیاں کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی پابندی سے کیا نقصانات ہوتے ہیں اور رسم و رواج میں اصلاح کس طرح کی جا سکتی ہے۔ لوگوں کو نقصان رساں اور بُری رسمیں چھوڑنے کی ترغیب دینے کے لیے سرسید نے خود عملی مثالیں پیش کیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی عمل کرنے پر آمادہ کیا۔ تاکہ ان کی اصلاحی کوششیں محض پند و نصائح تک محدود نہ رہیں بلکہ ان پر عمل بھی کیا جائے۔

رسم و رواج اور ان کی نوعیت

کسی قوم میں رسم و رواج کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ ان کا آغاز کس طرح ہؤا کرتا ہے اور ان میں بُرائیاں کیوں کر پیدا ہو جاتی ہیں اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے بُری رسموں کو ختم کرنا کس قدر ضروری ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ جو لوگ حسنِ معاشرت اور تہذیب، اخلاق و شائستگی اور عادات پر بحث کرتے ہیں ان کے لیے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو بُرا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے۔ کیونکہ جن باتوں کی چھٹپن سے عادت اور موانست ہو جاتی ہے وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن کسی بات کو اچھا قرار دینے کا یہ معیار درست نہیں۔ کیونکہ اس کے تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا اور عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے۔ اور جس کا رواج نہ ہؤا اور عادت نہ پڑی وہی بُری ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بھلائی اور بُرائی کی نفس مستقل چیز ہے۔ [illegible] البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی [illegible]

[illegible] کے سب اس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہٖ بری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ پس ہم کو اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے صرف اچھے ہونے پر بھروسہ نہ کر لینا چاہیے۔ بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیے۔ تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو جو حقیقت میں بد ہو اور بہ سبب رسم و رواج کے ہم کو اس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو تو معلوم ہو جائے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ بھلائی یا بُرائی فی نفسہٖ بھی کوئی چیز ہے تو ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقے کے تلاش کرنے اور اس کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا بُرائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کام کے لیے سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں خالی کریں۔ اور اس دلی نیکی سے جو خدا تعالےٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے ہر ایک بات کی بھلائی یا بُرائی دریافت کرنے پر متوجہ ہوں۔ یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک اور دوسری قوم اور دوسرے ملک دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہیے۔ تاکہ جو رسم و عادت ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں اور جو ہم میں بُری ہے اس کے چھوڑنے پر کوشش کریں۔ جو رسم و عادت دوسروں میں اچھی ہے اس کو بلا تعصب اختیار کریں۔ اور جو ان میں بُری ہے اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔[1]

رسوم و عادات کا مبدا و منشا

جب ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسوم و عادات مروج ہیں اُنھوں نے [illegible] کس طرح رواج پایا ہے تو ان رسوم و عادات کے مختلف ہونے کے [illegible] متحد معلوم ہوتا ہے۔ قوموں میں جو عادتیں اور رسمیں

مروج ہیں ان کا رواج یا تو ملک کی آب و ہوا کی [illegible]
امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً تمدن و معاشرت کو پیش آئی [illegible]
دوسری قوموں کی تقلید و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں۔ یا انسان کی حالت ترقی یا
تنزل نے ان کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہرا یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک
ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا مبدا و منشا معلوم ہوتے ہیں۔ جو
رسوم و عادات کہ بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں ان کے صحیح
اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے
ان کو سکھلائی ہیں۔ مگر ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ بات
دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لندن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے
کی ضرورت ہے پس آگ کا استعمال دونوں ملکوں کی قوموں میں ایک سچی
اور صحیح عادت ہے۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ آگ کے استعمال کے لیے یہ طریقہ
بہتر ہے کہ مکانات میں ہندسی قواعد سے آتش خانہ بنا کر ہم آگ کی گرمی سے
فائدہ اٹھائیں یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر ان کو گردن میں لٹکائے پھریں
جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جائے۔ طریق تمدن و معاشرت
روز بروز انسانوں میں ترقی پاتا جاتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہماری اور عادتیں
جو بضرورتِ تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں ان میں بھی روز بروز ترقی
ہوتی جائے۔ اگر ہم اپنی ان پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں اور کچھ
ترقی نہ کریں تو بلاشبہ بمقابل ان قوموں کے جنھوں نے ترقی کی ہے ہم ذلیل و
خوار ہوں گے۔[۲]

رسمیں اختیار کرنے کا اصول

دوسری قوموں کی رسموں کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل [illegible]
محض اندھے پنے سے صرف تقلید میں بغیر [illegible]
ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں [illegible]

[illegible] کام کریں تو اس قوم سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکتے [illegible] اس رسم سے کوئی موانست نہیں ہوتی اور اس کی حقیقی [illegible] کا اچھا موقع ملتا ہے۔ بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ [illegible] اس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے، ہم کو بہت اچھی مثالیں سینکڑوں برس کے تجربے کی ملتی ہیں جو اس رسم کے اچھے یا بُرے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔ لیکن اکثر جگہ یہ بات موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بہ سبب اختلاط و ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادہ کے اور ان کی بھلائی اور بُرائی پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہو گئی ہیں۔ جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا حال ہے کہ تمام معاملات زندگی بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی اُنھوں نے ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں، یا کوئی نئی رسم اس قوم کی رسم کے مشابہ ایجاد کر لی ہے۔ جب ہم یہ چاہتے ہیں کہ اپنے طریقِ معاشرت اور تمدّن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچائیں تاکہ وہ قومیں جو ہم سے زیادہ مہذب ہیں ہم کو بہ نظرِ حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بہ نظرِ تحقیق دیکھیں اور جو بُری ہوں ان کو چھوڑ دیں اور جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔

جو رسوم کسی قوم کی حالتِ ترقی یا تنزل کے سبب سے پیدا ہوئی ہیں وہ اس میں ٹھیک ٹھیک اس قوم کی ترقی اور تنزّل یا عزّت اور ذلّت کی نشانی ہوتی ہیں۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلے گی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں۔ مگر اتنا فرق بے شک ہوگا کہ بعضی قوموں میں ایسی رسومات و عادات جو درحقیقت بُری ہوں کم ہیں اور بعضی میں زیادہ۔ [illegible] قوم پہلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے۔ بعض ایسی قومیں بھی ہیں [illegible] کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہنچایا ہے۔ اور اس [illegible] نے اپنے نقصانوں کو چھپا لیا ہے۔ جیسے کہ ایک [illegible] سے گدلے اور کھاری پانی کو چھپا لیتا ہے یا

ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ [illegible] کسی دوست [illegible] لطیف اور خوش گوار ہو جاتا ہے۔ اور یہی قومیں ہیں جو اب دنیا میں [illegible] جاتی ہیں اور درحقیقت اس لقب کی مستحق بھی ہیں۔

رسم و رواج کا اثر

معاشری، مذہبی، سیاسی مختلف قسم کی رسمیں کم و بیش ہر ملک میں پائی جاتی ہیں اور تمام ممالک کے لوگوں پر رسم و رواج کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات تو یہ قانون اور مذہبی عقیدہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن مختلف قوموں کی رسموں میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ سرسید کے خیال میں عوام پر رسم و رواج کے اثرات کا سبب یہ ہے کہ رسم ایک ایسی چیز ہے جو پرکھوں کے وقت سے ہوتی چلی آتی ہے۔ جس پر لوگ مدت سے اتفاق کرتے چلے آتے ہیں اور اس طرح رسم ایک قانون کے طور پر سند ہو جاتی ہے ایسا کام بھی جو کبھی عیب سمجھا جاتا ہو جب رواج پا جاتا ہے تو لوگوں کی نظر میں عیب نہیں رہتا۔ رسم و رواج کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان جیسے ملک میں بھی رسم و رواج کو بن لکھے قانون کی حیثیت حاصل ہے۔ رسم و رواج کو قانونی مرتبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اتنے پرانے ہو جاتے ہیں کہ اس کے برخلاف ہونا لوگوں کی یاد سے باہر ہو جاتا ہے۔ رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دل پر اس قدر مستحکم ہو جاتی ہے کہ لوگ غلاموں کی طرح ان کی تابعداری کرتے ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم، نادان اور عقل مند سب برابر اس کی غلامی کرتے ہیں۔

جو رسم مذہبی سند پر یا مذہبی خیال پر قایم ہوئی ہے اس کا اثر انسانوں کے دلوں پر بہ نسبت ان رسموں کے جو اور طرح پر قائم ہوئی ہوں بہت زیادہ سخت اور نہایت قوی ہوتا ہے۔ جو لوگ مذہبی رسومات کے پابند ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی رسمیں سچائی اور انسان کی بھلائی کے لئے [illegible] ہیں۔ اور ان سے زیادہ ترقی کرنا ممکن نہیں [illegible]

ترقی یا اصلاح کرنی چاہیے، خواہ یہ اصلاح اسی مذہب کی سند پر ہو جس کی یہ رسمیں ہوں تب بھی لوگ اس کو کافر اور مذہب سے خارج قرار دیں گے اور اس کا ٹھکانا بجز جہنم کے اور کہیں نہیں بتلائیں گے۔ اکثر قوموں میں بہت سی ایسی رسمیں پائی جاتی ہیں جو درحقیقت ان کے اصل مذہب کے برخلاف ہوتی ہیں مگر ان رسموں نے ان کے دلوں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑ لی ہے کہ خود مذہب کی طاقت بھی ان رسموں کو اکھاڑ نہیں سکتی۔

تبدیلی کی ضرورت رسم و رواج خواہ کسی قسم کی ہوں ان کا تبدیل کرنا اور ان کو ترقی دینا انسانی سوسائٹی کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ ہر ایک انسان کو زندگی کے لیے سانس لینا۔ اور متغیر ہوا کو نکالنا اور تازہ حیات بخش ہوا کو اندر کھینچنا۔ رسمیں نتیجہ ہیں زمانے کی حالت کا اور زمانے کی حالت ہمیشہ قابلِ تغیر ہے پس رسمیں بھی قابلِ تغیر ہیں۔ رسومات میں اصلاح کرنے کی ضرورت خود انسان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ جب ہم انسانوں کی سوسائٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی تمام رسمیں کیا مذہب کی اور کیا حکومت کی اور کیا معاشرت کی مختلف پاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ایک کی رسم کو دوسرے کی رسم کے برعکس یعنی نقیض پاتے ہیں اور چونکہ دو نقیض کبھی سچ نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے دونوں کی دونوں رسمیں بھی اچھی نہیں ہو سکتیں۔ پس رسومات متناقضہ کا موجود ہونا ہی کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ رسومات کا توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضروری ہے۔

مذہبی رسموں میں تضاد ہر ملک اور قوم کی مذہبی، سیاسی اور معاشرتی رسموں میں جو تناقض ہے اس کو واضح کرنے کے لیے سرسید نے مثالیں دے کر کہا کہ "اگلے زمانے کے یونانیوں مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں کو دیکھو جو مذہبی رسومات میں بیسیوں دیوتاؤں کو

ماننا اور ان کی پرستش بجالانا اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر یہودی اور مسلمان ٹھیک اس کے برخلاف ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کی پرستش کرنا ٹھیک جہنم میں جانا ہے۔ یہودی اور مسلمان اور ہندو جگ کے وقت اپنی نجات کے لیے قربانیاں کرتے ہیں مگر ایک بدھ مذہب کا پیرو اس کو بہت بڑی ہتیا اور سخت عذاب کا کام سمجھتا ہے۔ ہندو اور رومن کیتھولک اپنے پیشواؤں کی مورتیوں کے سامنے پرستش کرنا روحانی خوشیوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر یہودی اور پروٹسٹنٹ اور مسلمان اس کو روحانی موت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ایک ہندو نہایت سچائی اور دلی اعتقاد سے اور بیکنٹھ میں جانے کے یقین سے ایک دیوتا کی مورت پر اپنی جان کو قربان کرتا ہے مگر اسلام ایسے فعل کو خودکشی قرار دیتا ہے اور اس کے کرنے والے کو نرک میں ڈالتا ہے۔ ایک ہندو اپنے باپ کی لاش کو کس محبت اور عزت اور نیکی اور ابدی نجات کے یقین سے آگ میں جلاتا ہے اور پھر اس کی جلی مٹی سے ہڈیوں کو چن کر ان کا نام پھول رکھتا اور ان کو گنگا میں بہاتا ہے۔ مگر ایک یہودی، عیسائی یا مسلمان اس کو نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کا کام سمجھتا ہے۔ وہ کسی مجرم کی لاش کو بھی آگ میں ڈالنا گناہ سمجھتے ہیں۔ اور ان کے خیال میں بھی نہیں آتا کہ اپنے عزیز کی لاش کو خود اپنے ہاتھ سے جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیں۔"

معاشری رسموں میں اختلاف

یہ تو مذہبی رسومات کا حال ہے۔ اور معاشرت و تمدن کی رسومات میں اختلاف کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ ہندو معاشرہ میں دختر کشی کی رسم عزت و غیرت کا تقاضہ سمجھی جاتی تھی اور ستی کی رسم قابل ادب و تعظیم تصور کی جاتی تھی۔ لیکن مہذب قوموں کے خیال میں یہ رسمیں وحشیانہ تھیں۔ چنانچہ انگریزوں نے ان کو قتل انسانی قرار دے کر اس کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سخت سزا کا قانون بنایا۔ معاشری رسوم کے اختلاف کو ذہن نشین کرنے کے لیے سرسید

نے تفصیل سے بیان کیا کہ ایک قوم سر ننگا کرنا اور پاؤں میں جوتا پہنے رہنا نہایت تعظیم و ادب کا اظہار سمجھتی ہے مگر ہندوؤں میں سر ڈھانکے رہنا اور ننگے پاؤں ہو جانا نہایت درجہ ادب و تعظیم کا کام سمجھا جاتا ہے۔ ایک قوم کی لڑکی نہایت پاک اور محبت سے بھرے ہوئے دل سے اپنے لیے آپ شوہر پسند کرتی ہے۔ مگر ہندوستان کی ایک قوم کی لڑکی بیاہ کے بعد بھی کبھی اپنے شوہر سے بات تک نہیں کرتی۔ ہندوستان کی ایک قوم کولین میں کثرت ازواج کی رسم کیسی عمدہ اور مبارک سمجھی جاتی ہے اور ستر برس کے بڈھے سے سات برس کی لڑکی کی جو اکہترویں بیوی اس بڈھے کی ہوتی ہے شادی کی جاتی ہے اور شادی کرنے والے اس شادی کو بہت بڑا ثواب اور نہایت عمدہ کام سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندو بھی کثرت ازواج کو معیوب نہیں سمجھتے اور بعض مسلمان بھی چار تک بیویاں کر لیتے ہیں۔ مگر یورپ کی سوسائٹی میں کثرت ازواج پر مثل ایک سنگین جرم کے سزا دی جاتی ہے۔ زیادہ تعجب اس قوم کی رسم پر ہوتا ہے جو کوہستان سراج کلو علاقہ کانگڑہ میں آباد ہے اور جو کنیت کہلاتی ہے۔ اس قوم میں یہ رسم ہے کہ چار پانچ بھائیوں میں صرف ایک عورت ہوتی ہے۔ یعنی وہ سب ایک سے شادی کرتے ہیں اور وہ عورت سب کی جورو ہوتی ہے۔ جو شوہر خلوت کے مکان میں اس کے پاس جاتا ہے اپنی لاٹھی اور جوتی باہر چھوڑ جاتا ہے تاکہ دوسرا شوہر اس نشانی کو دیکھ کر الٹا پھر جائے۔ ایک زمانہ میں اسپارٹا میں بھی ایسی رسم تھی وہاں کے مرد بغیر خاص وجہ کے ایک سے زیادہ شادی نہ کر سکتے تھے لیکن عورتیں ایک سے زیادہ خصم کرنے کی بلا قید مجاز تھیں۔ اور کئی کئی خصم ساتھ رکھتی تھیں۔ چین میں دانتوں کا سیاہ کرنا نہایت مقبول رسم ہے اور جب ایک چینی یورپ جاتا ہے اور لیڈیوں کے سفید اور موتی جیسے آبدار دانت دیکھتا ہے تو اس کو بڑا تعجب ہوتا ہے۔ اور جب وہ ان کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو اور بھی تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ کیونکہ چین میں تو عورتوں کے پاؤں لوہے کے شکنجے میں جکڑ جکڑ کر اتنے چھوٹے کر دیے جاتے ہیں کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں۔

اگر کوئی اشراف مسلمان خاندان کی عورت بے پردہ ہو کر شہر میں نکلے تو کون سا عیب ہے جو اس پر نہ لگایا جائے گا۔ مگر اس ملک میں فتحمند انگریز قوم کی عورتیں مثل مردوں کے باہر پھرتی ہیں۔ اور مردوں کی مانند علم و تربیت حاصل کرتی ہیں۔ میسور کی قوم میں یہ رسم ہے کہ جب کسی عورت کے ہاں اوّل مرتبہ لڑکا پیدا ہوتا ہے یا بانجھ عورت کسی لڑکے کو متبنیٰ کر لیتی ہے تو وہ اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کی ایک ایک پور کٹوا ڈالتی ہے اور اس کو نہایت مبارک سمجھتی ہے۔ لیکن دوسری قوموں کو اس عجیب رسم پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔

ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مختلف معاشروں میں ایسی رسمیں ہیں جن کو ایک قوم نہایت اچھی اور دوسری نہایت بُری سمجھتی ہے۔ اور یہ رسمیں ایک دوسرے کے برخلاف ہیں۔ اس لیے دونوں اچھی نہیں ہو سکتیں۔ پس اگر رسموں کی پابندی کی جائے تو ضرور کوئی نہ کوئی قوم بُری رسموں میں مبتلا رہیگی۔

رسمیں ہمیشہ بدلتی رہی ہیں جو لوگ رسموں میں تبدیلی کے خلاف ہیں وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ موجودہ رسمیں بھی ان لوگوں کے بزرگوں نے اصلاح و ترمیم و تبدیلی کر کے قایم کی تھیں کیونکہ وہ ان رسموں سے زیادہ وحشیانہ رسموں میں مبتلا تھے۔ اگر تبدیل نہ ہوئی ہوتی تو اب تک یہ حالت ہوتی کہ کسی کے آگے پیچھے دوپٹے بندھے ہوتے اور کسی کے کسی جانور کی بالوں دار کچی کھال لپٹی ہوتی۔ رسوم میں اصلاح کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں وہ ابتدا میں لوگوں کو اس لیے بُرے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی بے علمی یا ناقص تعلیم ان میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہونے دیتی کہ وہ اس تعصب، جہالت اور ہٹ پر غالب آئیں جو رسومات کے بارے میں ان کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ جو لوگ رسموں کو بُرا سمجھتے اور ان میں تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں وہ اس پر حیراں ہوتے ہیں کہ رسموں کو کیوں کر چھوڑا جائے۔ کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ

دست اندازی کرے اور بُری رسمیں چھڑانے کا موقع دے۔ یعنی وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ گورنمنٹ کو بدنام کریں اور وہ خود بدنامی سے محفوظ رہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر برادری کا اتفاق ہو جائے اور بزرگ لوگ رسموں کو چھوڑ دیں تو کام بن جائے گا۔ لیکن رسموں کو بدلنے پر اتفاق نہیں ہوا کرتا۔ رسموں کو بدلنے کے لیے سرسیّد نے لوگوں کے اتفاق کے بجائے لوگوں سے اختلاف کو ضروری قرار دیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو وہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی اور بہادری سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح کرے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوم اس کو بُرا کہے گی مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے۔ اور جس طرح کہ اوّلاً وہ ہدفِ تیرِ ملامت ہُوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

اچھی اور بُری دونوں قسم کی رسمیں تقریباً ہر قوم میں پائی جاتی ہیں۔ اور جیسا کہ ہونا چاہیے اچھی رسمیں معاشرہ کے لیے مفید ہوتی ہیں اور بُری رسمیں نقصان پہنچاتی ہیں۔ لیکن اچھی رسمیں بھی ایسی پابندی سے کہ ان میں ترمیم و اصلاح نہ ہو سکے بُری بن جاتی ہیں اور جن رسموں کی پابندی کے لیے لوگوں کو زبردستی مجبور کیا جاتا ہے وہ بھی بہت نقصان رساں ثابت ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کے خیالات اور ان کی صلاحیتوں پر بُرا اثر ڈالتی ہیں۔

تقلید کی عادت پڑ جاتی ہے سرسید نے اس بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس قوم میں پُرانی رسم و رواج کی پابندی ہوتی ہے اور رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے وہاں زندگی کا منشا معدوم ہو جاتا ہے۔ بے سوچے اور بے سمجھے رسومات

کی پابندی کرنے سے خواہ وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی ان صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدا تعالےٰ نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ اس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا۔ اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اسی صورت میں ہوتی ہے جب کہ وہ استعمال میں لائی جائیں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ اور ایسے شخص کے لیے بجز ایسی قوتِ تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی۔ لیکن جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔ زمانۂ حال پر نظر کرنے کے لیے اس کو قوتِ تخلیق اور انجام کار پر غور کرنے کے لیے قوتِ تجویز اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوتِ استقرا اور بھلا برا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لیے قوتِ استقلال درکار ہوتی ہے۔ اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو کام اس کے واسطے مقرر کر دیا گیا ہے اسی کو انجام دیا کرے۔ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں سے جو خدا نے اس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے۔ پھولے اور پھلے۔ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل امر یہ ہے کہ لوگ اپنی فہم اور عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں۔ یعنی جو عمدہ اور مفید ہیں ان کو اختیار کریں۔ جو قابلِ اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں اور جو بری اور خراب ہوں ان کی پابندی چھوڑ دیں۔[۹]

ذاتی قوتیں پژمردہ ہو جاتی ہیں

ہمارے زمانے میں ہر شخص اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند اور ہماری ناپسند کے لائق کیا بات ہے۔ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میرے رُتبے اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور اگر وہ اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہو تو اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا اور یہ پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں اور رُتبہ و مقدور میں مجھ سے زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں تاکہ وہ بھی ایسا ہی کر کے انہی کی سی شان میں شامل ہو جائے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجا لاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کو ترجیح دیکر پسند کرتے ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا اس لیے طبیعت خود رسموں کی پابندی کی متحمل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کرنے کی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال دل میں پہلے آتا ہے۔ وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں۔ اور جو باتیں رسم و رواج کے مطابق نہ ہوں ان سے ایسے ہی گریز کرتے ہیں جیسے کہ مجرموں سے۔ یہاں تک کہ خود اپنی طبیعت کی پیروی نہ کرتے کرتے ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی جس کی کہ پیروی کریں۔ اور ان کی ذاتی قوتیں پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب بالکل ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی اُٹھانے کے قابل نہیں رہ جاتے۔"

قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے

ممکن ہے کہ اس زمانے میں جب کہ رسمیں مقرر کی گئیں وہ مفید تصور کی گئی ہوں لیکن اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا ان کی رائے میں غلطی ہو۔ ان کا تجربہ صحیح نہ ہو یا اس کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو۔ یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانے میں مفید ہو مگر حال کے زمانے میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو گئی ہو۔ یا جن حالات میں وہ رسم قائم کی گئی تھی وہ حالات نہ ہوں۔ اس لیے رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی اور نقصان نہ ہو تب بھی یہ نقصان تو ضرور ہے کہ اس سے آدمی کی عقل و دانش، جودتِ طبع اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔ رسومات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی اور مفید و غیر مفید اور مناسب حال و مطابق طبع ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اس لیے انسان میں ترقی کی جو قوتیں ہیں وہ معدوم و مفقود ہو جاتی ہیں۔[11]

ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے

سرسید کی یہ رائے ہے کہ رسموں کی پابندی انسان کی ترقی میں مانع و مزاحم ہوتی ہے اور اس کے تنزل کا باعث بن جاتی ہے۔ اور اپنے اس خیال کی تائید میں انھوں نے ایشیائی ملکوں کو مثال کے طور پر پیش کر کے یہ واضح کیا کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا دارومدار رسم و رواج پر ہے۔ اور یہاں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ اور اب یہ دیکھ لو کہ مشرقی اور ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔ ان مشرقی قوموں میں بھی کسی زمانے میں قوتِ عقل اور جودتِ طبع اور مادۂ ایجاد ضرور موجود ہو گا جن کا بدولت [illegible] ہوئیں جو اب رسمیں ہیں۔ مگر اب یہ حالت ہے کہ اسی رسومات [illegible]

[illegible] لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں
[illegible] میں آوارہ پڑے پھرتے تھے جس وقت ان مشرقی
[illegible] شان محلوں میں رہتے تھے۔ اور بڑے بڑے عبادت خانے
[illegible] اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانے
میں ان قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی بھی تو اس کے ساتھ
ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔ تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی
قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی
ہے۔ یہ ترقی اسی وقت مسدود ہوتی ہے جب اس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے
جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا یہی حال
ہے۔ ان کی ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا اور تنزّل اور ذلّت و خواری کا
زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا۔[۱۲]

یورپ کی قوموں میں بھی جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار
ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی بھی ہے۔
اور اگر ان کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو ان قوموں
کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا۔ مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں میں پابندی
رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی تبدیلی میں کوئی امر
[illegible] نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں تو پرانی رسم
[illegible] چھوڑ دی جائے گی اور نئی رسم اختیار کر لی جائے گی۔ اور اس سبب سے
[illegible] کے قوائے عقلی اور حالتِ تمیز اور قوتِ ایجاد ضایع نہیں ہوتی۔ اس وقت
[illegible] میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے
[illegible] ایجاد کرے اور لوگ اس پر اتفاق کریں تو وہ اسی
[illegible] تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی رہتی ہے۔
[illegible] رہتی ہیں۔ اور ملکی معاملات اور تعلیم میں اور

اخلاق میں بلکہ مذہب میں بھی ہمیشہ [illegible]

مفید رسمیں بھی بعض اچھی اور مفید رسمیں اور [illegible]
مضر بن جاتی ہیں اور اصلاح نہ ہوتی رہے تو نقصان [illegible]
اور مفید رسموں کے غیر مفید امکانات کو [illegible] کرنے کے
لیے سرسید نے انگریزوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے رجحان کی مثال دیتے ہوئے
کہا کہ انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف اور لائق خواہش کے
ہے اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی
بات اس کے تنزل کا باعث ہوگی بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے۔ اور وہ
بات یہ ہے کہ تمام انگریز جو حبِ وطن میں نامی ہیں اس بات پر نہایت کوشش اور
جاں فشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جائیں اور سب اپنے خیالات
اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے ماتحت کر دیں۔ اور ان کوششوں کا نتیجہ
انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ انگلستان میں پہلے مختلف درجوں اور
مختلف پیشوں کے لوگ گویا جدا جدا دنیا میں رہتے تھے۔ اور سب کا طریقہ اور عادتیں
جدا جدا تھیں۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب
ایک محلہ کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ
رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں۔ ایک ہی سی
باتیں سنتے ہیں۔ ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں۔ یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں
اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں۔ ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل
ہیں۔ اور ان حقوق اور آزادی کو قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں۔ یہ مشابہت
اور مساوات روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور [illegible]
اس کو اور زیادہ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ [illegible]
الوالعزمی کے کام ایسی حالت میں [illegible]
کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے۔ [illegible]
اور ان سب پر آزادی اور عام رائے [illegible]

[illegible] رائیں اور عادتیں اور طریقِ زندگی اور قواعد
[illegible] یکساں ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلاشبہ ملک
[illegible] اور ترقی پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے
عمدہ [illegible] ہو سکتا مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجے کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ
ہوتی رہے باعثِ تنزل قرار دیتے ہیں اور سبب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ
ایک سی طبیعت اور عادات اور خیالات کے ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں سے
وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد
حسنِ معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل اور کمزور ہوتی جاتی ہیں۔ اور ایک زمانہ ایسا
آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ آتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے[۱۳]

چینی قوم کی مثال

کسی قوم کی اچھی رسموں اور رواج میں بھی اصلاح اور ترمیم نہ ہونے اور یکسانیت کے حد سے زیادہ بڑھ جانے سے جو نقصان ہوتا ہے اس کو ذہن نشین کرنے کے لیے سرسید نے چینی قوم کی مثال دیکر کہا کہ ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لئیق آدمی ہیں۔ بلکہ بعض باتوں پر اگر لحاظ کیا جائے تو عقل مند بھی ہیں۔ ان کی قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم بھی تھے اور اس لیے ابتدا ہی سے ان میں اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں۔ چین کے لوگ اس بات میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں وہ ہر شخص کی طبیعت پر منقش کرنے کے واسطے اور اس بات کے لیے کہ دانش مندوں کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انھوں نے انسان کی ترقی کو پا لیا اور اس لیے ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی مگر برخلاف اس کے [illegible] حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے۔ [illegible] تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب کے [illegible] ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد

اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے اور [illegible]
کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ان میں سے [illegible]

مسلمان اچھی رسمیں اختیار اور بُری رسمیں ترک کریں

بُری رسموں کی خرابی [illegible]
تقلید کے نقصانات اور [illegible]
واصلاح کی بجائے سکون و جمود پیدا ہو جانے
کے بُرے نتائج کو بیان کر کے سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ ہم
مسلمان جن کی رسومات عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور
کوئی رسم بلا خیال دوسری قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جس میں ہزاروں نقص
اور بُرائیاں ہیں، اگر ان رسموں کے پابند رہیں اور ہم نہ تو ان کی بھلائی بُرائی پر
غور کریں اور نہ ان کی اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھند ان کی
پیروی کرتے جائیں تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہمارا حال نہایت خراب ہوگا۔ رسومات کی
پابندی کے سبب چینیوں کا جو حال ہوا ہے ہماری حالت اس سے بھی بدتر ہو گئی
ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم آپ ترقی کر سکیں۔ اس لیے بجز
اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو
اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجائیں اور ہم
میں قوتِ ایجاد پھر پیدا ہو ہم اس قابل ہوں گے کہ اپنی ترقی کے لیے خود کچھ کر سکیں۔
اگر ہم دوسری قوموں سے از راہِ تعصب نفرت رکھیں اور زندگی کا کوئی نیا طریقہ
خواہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو صرف اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے
سبب معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور ترقی کی کیا توقع ہو سکتی [illegible] ہم
مسلمان ہیں اور اپنے مذہب کو دل سے سچ جانتے ہیں۔ اس لیے [illegible]
ضروری ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ ہم جو بات معاشرت [illegible]
کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کریں اس کی [illegible]
شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ [illegible]

[illegible] بلا لحاظ پابندی رسوم اور بلا لحاظ اس بات کے [illegible] کی ترقی کے لیے اس کو اختیار کر لینا ہمارا فرض ہے۔[۱۵]
[illegible] مقصد یہ تھا کہ پورے ملک کی حالت درست ہو جائے لیکن [illegible] اصلاح پر وہ خاص طور سے متوجہ تھے اور اس کو اپنا اوّلین مقصد قرار دیتے تھے۔ چنانچہ رسم و رواج کی اصلاح کے سلسلہ میں بھی اُنھوں نے مسلمانوں کو بالتخصیص متوجہ کیا اور کہا کہ اپنے ہم مذہب بھائیوں کے ساتھ میری دلسوزی اس وجہ سے ہے کہ میری دانست میں ہم مسلمانوں میں بہت سی رسمیں جو درحقیقت نفس الامر میں بُری ہیں، مروّج ہو گئی ہیں۔ جن میں سے ہزاروں ہمارے پاک مذہب کے بھی برخلاف ہیں اور انسانیت کے بھی مخالف ہیں اور تہذیب و تربیت و شائستگی کے بھی برعکس ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب لوگ تعصب اور ضد اور نفسانیت کو چھوڑ کر بُری رسموں اور بدعادتوں کو چھوڑنے پر مائل ہوں اور جیسا کہ پاک و روشن اور ہزاروں حکمتوں سے بھرا ہوا ہمارا مذہب ہے اسی طرح ہم اپنی رسوماتِ معاشرت و تمدن کو بھی عمدہ اور پاک و صاف کریں اور جو کچھ نقصانات ان میں ہیں خواہ وہ کسی وجہ سے ہوں ان کو دور کریں۔ ہماری قوم کے نیک اور مقدس لوگوں کو کبھی یہ خیال آتا ہے کہ تہذیب اور حُسنِ معاشرت و تمدن صرف دنیاوی امور ہیں جو صرف چند روزہ ہیں۔ اگر ان میں ناقص ہوئے تو کیا اور کامل ہوئے تو کیا۔ اور اسمیں عزت حاصل کی تو کیا اور ذلیل رہے تو کیا۔ مگر ان کی اس رائے میں قصور ہے۔ اور ان کی نیک دلی اور سادہ مزاجی نے ان کو اس عام فریب غلطی میں ڈالا ہے۔ انسان تمدن و معاشرت سے متعلق امور سے کسی طرح علاحدہ نہیں ہو سکتا اور نہ شارع کا مقصود ان تمام امور کو چھوڑنے کا تھا۔ کیونکہ قواعد قدرت سے یہ امر غیر ممکن ہے پس اگر [illegible] و معاشرت ذلیل اور معیوب حالت پر ہو گی تو اس سے [illegible] عائد ہو گی اور یہ ذلت صرف افراد و اشخاص پر منحصر [illegible] جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ مسلمان

یعنی وہ گروہ جو مذہب اسلام کا پیرو ہے نہایت [illegible]
افعال و عاداتِ قبیحہ سے اسلام کی رسوائی ہوتی ہے پس ہماری [illegible]
کی حسنِ معاشرت اور خوبیِ تمدّن اور تہذیبِ اخلاق اور تربیت و شائستگی میں
کوشش کرنا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو دنیاوی امور سے جس قدر متعلق ہے
اس سے بہت زیادہ دین سے علاقہ رکھتا ہے[۱۱]"

بااثر اور ذی مرتبہ لوگوں کا فرض

رسوم و رواج کے آغاز، معاشرہ پر ان کے اثرات، مختلف قوموں کی رسوم میں اختلاف، رسم و رواج کی اندھی تقلید اور جمود کے نقصانات، اچھی رسموں کے بگڑ جانے کا امکان اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تمام رسموں میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت کو واضح کر کے سرسیّد نے دوسری قوموں کے اچھے طور طریقے اختیار کرنے کے فوائد بیان کئے۔ اور اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان میں جو نہایت بُری اور نقصان رساں رسمیں موجود ہیں ان کی اصلاح کس طرح کی جا سکتی ہے سرسید کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کے بااثر سردار اور ذی رتبہ لوگ اپنے رعب و داب کو استعمال کر کے اپنے ہم وطنوں کی بھلائی کے لیے کام کر سکتے ہیں۔ جولائی ۱۸۶۶ء میں سائنٹیفک سوسائٹی میں لکچر دیتے ہوئے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ہندوستان میں ذی رتبہ اور باوقار آدمیوں کی نہایت تعظیم اور عزت کی جاتی ہے۔ لوگ برہمن اور مولوی کی بات سنتے ہیں۔ اور ہمارے ملک کے ذی رتبہ لوگ اپنے اثر سے کام لے کر بہت کچھ اصلاحی کام کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سی ایسی رسمیں ہیں جو غرور یا نمود یا اعتقادِ باطل پر مبنی ہونے کی وجہ سے ناجائز اور [illegible] رسموں کے گھٹانے اور مٹانے میں دولت مند اور ذی وقار [illegible] کر سکتے ہیں۔ ایسی بُری رسموں کو جو اخلاق کی [illegible] فلاح کے خلاف ہوں گوارا کرنا [illegible]

[illegible] مذہب کی رو سے قائم کی گئی ہوں۔

[illegible] ان بُری رسموں میں سے نہایت مشہور بُری رسم بیوہ کے ستی ہونے اور بیمار کو دمِ واپسیں دریا کے کنارے لے جا کر زبردستی سے اس کی جان نکالنے کی رسم تھی اور دختر کشی کی رسم ایک ایسی بد اور خراب رسم ہے کہ انسان کے دل میں جو اچھے اخلاق قبول کرنے کی قابلیت ہے یہ رسم صرف اسی کو مغلوب نہیں کرتی اور صرف بد اخلاقی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ مخلوق کی ترقی کی بھی مانع ہے جس کے سبب سے قوم کی شان و شوکت اور دولت بڑھ نہیں سکتی۔ ہندوستان میں اس مہیب جرم کا سبب یہ ہے کہ عالی خاندان مفلس راجپوت شادی کے سامان مہیا نہ کر سکنے کے اندیشے سے اپنے معصوم بچے کو مار ڈالتے ہیں۔ پس ہندوستان میں جو دختر کشی ہوتی ہے وہ شادیوں میں اسرافِ بے جا کی رسم کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ دولت مند اور شریف ذی وقار ہند و خصوصاً عالی خاندان راجپوت اس جاہلانہ رسمِ بد کو مٹانے میں اپنی کوششوں کے بہتر نتیجے حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس بات کا ہندو امیروں اور گورنمنٹ کو یقین بھی ہے۔ چنانچہ اودھ کے تعلقہ داروں اور راجپوتانہ کے راجاؤں نے اس کے دفع کرنے میں بہت سی کوشش کی، اور کامیاب ہوئے۔ لیکن ابھی تک اس بُرائی کی بالکل بیخ کنی نہیں ہوئی اور بہت سی دقتیں اس کے جڑ سے کھود ڈالنے کے لیے اُٹھانی پڑیں گی۔

ایک اور بُری رسم جس کو ہم مختصر بیان کریں گے بے تعداد جورویں رکھنا ہے۔ جس کا بعض بعض مقاموں میں رواج ہے۔ اس امر میں پند و نصیحت اور کوشش اس قدر کام نہ کرے گی جس قدر کہ اس کے امتناع کا ایک قانون اثر کرے گا۔ بُری رسموں کے سلسلہ میں ہم کو ایک اور نہایت بُری رسم پر جس سے فاحشہ عورتوں کا سلسلہ [illegible] ہوتا ہے۔ اور نہایت بُری عادت جس سے میلوں، تماشوں اور تہواروں [illegible] ڈرامک ٹیبل کھیل پھیلتا ہے توجہ کرنی ہے۔ ان سب خرابیوں کا [illegible] گویا قانون اور اخلاق کی تعمیل میں سستی اور کاہلی کرنا

ہے جس سے قوم کی معاشرت اور اخلاق [illegible]
میں ضرر پہنچتا ہے[۱۷]

اصلاحِ رسوم کا مؤثر ذریعہ اب ہم ان اسباب پر نظر ڈالتے ہیں [illegible] محسوس تو ہیں لیکن نہایت عمدہ اور [illegible] ہیں [illegible] ہندوستان کے دولت مند اور ذی وقار اور شریف آدمی بھلائی پہنچانے میں اپنے رعب و داب کو بہت کچھ کام میں لا سکتے ہیں۔ ان میں ہم اوّل معاملات عقلی اور بعدہٗ مذہبی و روحانی کا ذکر کریں گے۔ اس مقام پر بلاشبہ ہم اوّل درجہ تعلیم کو قرار دینا چاہتے ہیں۔ مشرقی دنیا میں بہت سے علوم اور عالم ہوئے ہیں لیکن اب تک اصلی یا دقیق علوم کا حاصل کرنا اور روزمرّہ کے کاروبار ہنر و فن میں موافق علم کے عمل کرنا باقی ہے۔ علم کے بموجب عمل کرنا ایسی چیز ہے کہ اس کے باعث سے یورپ کو اس قدر سربلندی حاصل ہوئی ہے۔ اور جو طبیعت یا رائے کی آزادی کے باعث سے نہایت عمدہ ہو گیا ہے۔ یورپ کی یہ آزادیِ طبیعت بہ سبب تہذیبِ مذہب کے پیدا ہوئی ہے۔ اور اس تہذیبِ مذہب کے باعث سے جو لوگ کہ جسم اور روح کے جبر و تعدّی میں مبتلا تھے اس سے آزاد ہو گئے۔ ہماری رائے میں اسی باعث سے یورپ اس بڑے درجے کو پہنچا ہے جو اس وقت اس کو حاصل ہے۔ اور شاید بہ سبب تہذیبِ مذہب کے ہندوستان بھی اس عالی رتبے کو پہنچ جائے گا جو اس کو اپنے حق کی وجہ سے دُنیا کے اور ملکوں میں حاصل کرنا چاہیے۔ پس ہم کو اپنے ملک کی ترقی کی توقع سچے اور عمدہ علم کے پھیلنے پر کرنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک عموماً علم نہ پھیلے گا اس وقت تک [illegible] کے خیرخواہ لوگ جو کچھ جانفشانی اور کوشش اپنے ملک کی بھلائی کے [illegible] اس کو کچھ استقلال اور ثبات نہ ہوگا۔ اس کی ایسی مثال [illegible] اندھیرا اور تاریکی ہو۔ اور اس میں خفیف سی روشنی [illegible] کی تمام عمر ایسی کوشش میں صرف ہو گئی [illegible] محل بنایا تھا۔

[illegible] برائیاں دور کرنے اور نیکی پھیلانے کے واسطے جس تعلیم کی [illegible] قسموں میں تقسیم کی جائے۔ یعنی دیسی زبان اور انگریزی زبان [illegible] ایسی تربیت جس سے جسم درست رہے اور آدمی توانا اور تناور ہوں۔ اور علم [illegible] اور مردوں اور عورتوں کی تعلیم اور تعلیم عام اور تعلیم خاص۔ عام تعلیم سے یہ مراد ہے کہ بہت سے دہقانوں کے گروہوں کو جو دیہات وغیرہ میں رہتے ہیں دیسی زبانوں میں بدرجۂ اعتدال تعلیم دی جائے۔ اور صرف لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔ یہ لوگ بہت محنت اور مشقت اور سختی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اس لیے ان کی جسمانی تربیت کے واسطے یہ طریقِ زندگی ہی کافی وافی ہے اور کچھ سکھانے سمجھانے کی حاجت نہیں۔ قصبوں اور شہروں کے واسطے ایسے اسکول اور کالج جن میں انگریزی اور دیسی دونوں زبانوں میں تعلیم دی جائے قائم ہونے چاہئیں یہ خاص تعلیم بڑے درجہ کی تعلیم کی ہوگی اور ان اسکولوں اور کالجوں میں بڑے دقیق علم کو بڑی منزلت دینی چاہیئے۔ ان کی بڑی جماعتوں کے طالب علموں کی جسمانی تربیت کے واسطے کسی عام مقام میں ایک اکھاڑہ بھی ہونا چاہیے۔ لڑکیوں کے واسطے علاحدہ مدرسے ہونے ضرور ہیں۔[۱۸]

عوام میں پروپگنڈا کی مہم

"علاوہ اس کے امیروں اور بڑے آدمیوں اور عالم وفاضل لوگوں کو چاہیے کہ اپنی ایسوسی ایشن اور سوسائٹی اس غرض سے بنادیں کہ مفید علم بہ ارزانی شایع کریں اور عمدہ عمدہ علوم اور فنون کو ترقی اور عظمت بخشیں اور فیاضی کے کام کریں۔ ایسے مفید علم کو جو عوام کے فہم سے مناسبت رکھتا ہو اس طرح پر بہ ارزانی شائع کریں۔ مفید مضمونوں پر اصول کی چھوٹی چھوٹی اور سستی کتابیں مشتہر کریں اور جابجا ایسے [illegible] مقرر کریں جو ان کو گلی کوچوں میں بیچتے پھرا کریں۔ اور صبح شام ان مقاموں [illegible] جمع ہوتے ہیں کوئی سستا اخبار سنانے سے بھی فائدہ ہوگا۔ لیکن [illegible] اس اخبار کے ذریعہ سے مہیا کی جائے وہ ایسی ہو کہ اس میں

گرمی اور جوش نہ پایا جائے۔ بلکہ ملائم اور ٹھنڈی ہووے۔ یعنی ایسی نہ ہو جس سے گمراہی حاصل ہو اور طبیعت بے فائدہ بھڑکے۔ اس عام اخبار کا ایڈیٹر جو تمام ہندوستان کے واسطے ہوگا ایسا نہایت عمدہ تعلیم یافتہ شخص ہونا چاہیئے جس کی طبیعت نہایت سلیم اور حلیم اور بے شر ہو۔ عمدہ عمدہ دقیق علوم و فنون کے رواج کے واسطے ایک علمی روزنامچہ کا مقرر کرنا اور علمی لیاقت یا خوبیِ صنعت کے واسطے انعام دینا ایسے عمدہ اور صاف طریقے ہیں کہ تھوڑے خرچ سے بہت سا مطلب ان سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بڑے درجہ کی روحانی اور مذہبی تعلیم کے واسطے مختلف مذہبوں کی حقیقت پر مباحثہ کرنے کے لیے جماعتیں مقرر کی جائیں جیسے کہ نہایت دانا اور اچھے ایشیا کے بادشاہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ ایمان کا زرِ خالص جن خراب باتوں سے پھیکا اور بدروپ ہو گیا ہے ان برائیوں کو خاص خاص کمیٹیاں لوگوں پر ظاہر کیا کریں اور مقدس کتابوں پر غور اور تمیز سے بحث کی جایا کرے۔

"بہت سے لوگوں کا متفق ہونا بڑے کام کی چیز ہے۔ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے عزت اور وقار اور اختیار عنایت کیا ہے وہ صرف اپنے ہی فائدوں کی رعایت اور حفاظت میں متفق اور مجتمع نہ ہوں بلکہ عام تعلیم اور نیک باتوں اور اخلاق کے ایسے معقول اور مضبوط اصولوں کو شائع کرنے میں بھی اتفاق کریں جن کے سبب سے ایک ملک قوموں میں امتیاز حاصل کرتا ہے۔"

رسموں میں اصلاح کی عملی مثال

ہندوستان میں جو نہایت خراب رسمیں مدت دراز سے چلی آ رہی تھیں ان میں بیوہ کو زندہ جلا دینا۔ جاں بلب مریض کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو قتل کر دینا سب سے زیادہ خراب اور انسانیت سوز رسمیں تھیں۔ انگریزی حکومت نے انتہائی سختی سے کام لے کر ستی کی رسم کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ اور مریضوں کو مار ڈالنے کی رسم بھی تقریباً بند ہو گئی تھی لیکن لڑکیوں کو مار ڈالنے

کے زمانے میں بھی جاری تھی۔ اور راجپوت اس کو عزّت و شرافت کی علامت تصور کرتے تھے۔ یہ تینوں بدترین رسمیں صرف ہندوؤں میں تھیں مسلمانوں میں تعدد ازدواج نے ایک نہایت خراب رسم کی شکل اختیار کرلی تھی، جو معاشری خرابیوں کے علاوہ مذہب کی بدنامی کا باعث بھی بن گئی تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ اس بُری رسم کو قانون کی طاقت سے روکا جائے اور اس کے لیے اُنھوں نے حکومت کو متوجہ کرنے کی ممکنہ کوشش کی۔ اس کے علاوہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ یہ واضح کیا کہ ایک سے زیادہ شادی کرنے کی مشروط اجازت دینے سے اسلام کا کیا مقصد تھا اور کن حالات اور کن شرائط کے تحت اس اجازت پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ، بسم اللہ اور اسی قسم کی دوسری بے شمار تقریبوں میں مسلمان جو رسمیں پوری کرتے تھے ان کا نتیجہ معاشی تباہی کی شکل میں نکلتا تھا۔ بڑے بڑے زمیندار اور دولت مند لوگ ان رسموں کے پیچھے دولت لٹا کر مقروض اور پریشان حال بن جاتے تھے۔ جائدادیں رہن ہو جاتی تھیں یا نیلام ہو جاتا تھا۔ اور معاشی حالت مستقل طور سے خراب ہو جاتی تھی۔ سرسید نے ان بُرائیوں کو دور کرنے کے لیے خود عملی مثالیں پیش کیں۔ چنانچہ اپنے لڑکے سید محمود کی شادی میں قریبی عزیزوں اور دوستوں تک کو مدعو نہ کیا۔ دعوتِ ولیمہ کرنے کے بجائے پانچ سو روپیہ مدرسہ کے فنڈ میں جمع کر دیا۔ اور جن لوگوں نے نیوتا دیا وہ بھی مدرسہ کو دے دیا۔ اسی طرح پوتے کی بسم اللہ کی تقریب بھی ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد سب ممبروں کی موجودگی میں کانفرنس کے پنڈال میں ہوئی۔ اور سرسید نے پانچسو روپے مدرسہ کی نذر کیے۔

رسوم و رواج کی اصلاح، اخلاق کی درستی، کردار کی تعمیر اور عادات کی تہذیب کے لیے سرسید عام تعلیم دینے کے بڑے حامی تھے اور اصلی یا دقیق علوم کو حاصل کرنا اور عملی زندگی میں ان علوم سے استفادہ کرنا قومی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے اُنھوں نے خود بھی

نہایت وسیع اور کامیاب جدوجہد کی اور ملک کے ذی [illegible] فرض کی انجام دہی پر متوجہ کیا۔ سرسید اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ بگڑے ہوئے معاشرہ کی خرابیاں درست کرنے میں حکومت کی امداد بہت موثر اور کارگر ثابت ہوئی ہے لیکن اس مقصد میں کامیابی کے لیے صرف حکومت کی امداد پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ معاشرہ میں جو لوگ ذی مرتبہ اور با اثر ہیں اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ بھی اصلاح و ترقی کے کاموں پر پوری توجہ کریں۔ اس لیے اصلاح معاشرہ کی جو تدبیریں سرسیّد کو مفید اور ضروری معلوم ہوئیں ان کو اختیار کرنے کے لیے اُنھوں نے حکومت کو بھی متوجہ کیا، با اثر لوگوں کو بھی ان کا فرض یاد دلایا اور خود بھی ہر ممکن حد تک اس پر عمل کیا اور یہی سبب ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

حوالے

۱ تا ۳۔ مجلّہ تہذیب الاخلاق۔ جلد اوّل۔ شمارۂ شوال ۱۲۸۷ھ

۴ تا ۸۔ تہذیب الاخلاق۔ جلد چہارم۔ شمارۂ شوال ۱۲۹۰ھ

۹ تا ۱۵۔ ماخوذ از مقالاتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ صفحہ ۲۰ تا ۳۱۔ و تہذیب الاخلاق۔ جلد اوّل۔ شمارۂ شوال ۱۲۸۷ھ

۱۷ تا ۱۹۔ سید احمد خاں کے لکچرز اور اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین گجراتی۔ لکچر سائنٹیفک سوسائٹی۔ جولائی ۱۸۶۶ء

۲۰۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۲۵۳

ساتواں باب

تمدن اور طرزِ معاشرت میں تبدیلی

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشری زندگی میں جو خرابیاں تھیں ان میں بہت سی نقصان رساں اور بُری رسموں کے علاوہ بعض ایسی باتیں بھی شامل تھیں جو اسلامی تعلیم اور زمانے کے ترقی یافتہ تہذیبی رجحان دونوں کے خلاف تھیں اور جن کی وجہ سے ایک طرف تو معاشری بُرائیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف اسلام کے مخالف عناصر مہذب دنیا کے سامنے ان باتوں کو پیش کر کے اسلام کو بدنام کرتے تھے۔ ان غیر اسلامی اور غیر مہذب طریقوں میں جو مسلمانوں میں رائج تھے، غلامی اور کثرتِ ازواج سب سے زیادہ معیوب تھے۔ اور معاشرہ کی اصلاح کرنے کے لیے غلامی کے طریقہ کو بالکل ختم کرنا اور تعدد ازواج کے مروجہ طریقوں میں اسلامی احکام کے مطابق اصلاح کرنا نہایت ضروری تھا۔ ان معیوب اور رسوا کن معاشری خرابیوں کے علاوہ تمدن و معاشرت میں کچھ ایسے نقائص بھی تھے جو بہت بدنما معلوم ہوتے تھے اور تہذیب و معاشرت کی ترقی کے لیے ان کی اصلاح پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت تھی۔ سرسید نے اصلاحِ معاشرت کے ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت کو بھی محسوس کیا اور ان کی اصلاح کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کیں۔

غلامی کو ختم کرنے اور عورتوں کو انسانی حقوق دینے کے لیے سب سے پہلے [illegible] اقدام اسلام ہی نے کیا۔ لیکن خود مسلمانوں کے غلط اور غیر اسلامی

طرزِ عمل نے یہ عام غلط فہمی پیدا کردی کہ اسلام غلامی کو مٹانے اور غلاموں کو انسانی حقوق دینے کا شدید مخالف ہے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ اسلام سے پہلے جن قوموں کو عروج حاصل ہوا ان کی پوری تہذیب نظامِ غلامی پر قائم تھی اور وہ اس کو ختم کرنا ناممکن خیال کرتی تھیں۔ لیکن اسلام نے اس ناممکن کو ممکن بنا دیا اور غلامی کے مکمل انسداد کی مؤثر اور قابلِ عمل تدبیریں اختیار کیں۔

غیر مسلم معاشروں میں عورتوں سے شدید بے انصافی کی جاتی تھی۔ ہر اعتبار سے ان کی حالت نہایت پست تھی اور ترقی یافتہ قوموں میں بھی ان کو معاشری حقوق حاصل نہ تھے۔ لیکن اسلام نے عورتوں سے بدسلوکی اور بے انصافی کو ختم کرکے ان کو ہر قسم کے حقوق دیئے اور قرآن نے یہ واضح کردیا کہ عورتوں کے حقوق بھی مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے کہ مردوں کے عورتوں پر۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ میں عورت کو مساوی مرتبہ حاصل ہوگیا۔ لیکن جب مسلمان زوال پذیر اور اسلامی تعلیمات سے دُور ہونے لگے تو انھوں نے غلاموں اور عورتوں کے بارے میں ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جو اسلام کے احکام اور مقاصد کے خلاف تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی معاشرہ کی جن خرابیوں کو اسلام نے سب سے پہلے دور کیا اور دوسری قوموں کو بھی ان خرابیوں کو دور کرنے کے مؤثر اور قابلِ عمل طریقے بتلائے انہی خرابیوں کو پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کا اُلٹا الزام اسلام پر عاید کیا جانے لگا۔

غلامی کا انسداد

اسلامی احکام کے مطابق غلامی کو ناجائز قرار دینے کے لیے سرسید نے اس موضوع پر کئی مضامین لکھے جو "رسالہ ابطالِ غلامی" کے نام سے کتابی شکل میں بھی شایع کئے گئے۔ سرسید نے غلامی کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ آزادی اور غلامی آپس میں ایسی متضاد ہیں کہ [illegible]

ہو سکتا ہے اور نہ دونوں کا ارتفاع۔ اس لیے یہ دونوں داخلِ مرضیٔ پروردگار نہیں ہو سکتے۔ اور ان میں سے ایک ہی مقتضائے قانونِ قدرت ہوگی! انسان ایک ایسی ہستی بنایا گیا ہے جس کی فطرت میں آزادی اور خود مختاری رکھی گئی ہے اور اس کو جو تمام قوائے ظاہری و باطنی دیے گئے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس پتلے کے صانع کی مرضی یہی تھی کہ یہ پتلا خود اپنا آپ مالک رہے۔ غلامی کی حالت میں انسان کے یہ قوے پژمردہ بلکہ محض معطل و بیکار ہو جاتے ہیں پس کسی طرح ایسی حالت صانع کی مرضی نہیں ہو سکتی۔ انسان کی وہ چیز جس سے انسان انسان کہلاتا ہے اور جس کا نام لوگ روح لیتے ہیں ایسی شریف چیز ہے کہ کسی کی مملوک ہونے کی لیاقت ہی نہیں رکھتی۔ کیا نتائج قانونِ قدرت یا روح یا امرِ رب کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم سی ہی ایک مخلوق ہماری ملکیت میں آ سکتی ہے؟ حاشا و کلا۔ پس صاف عیاں ہے کہ غلامی اس قادرِ مطلق کی مرضی اور قانونِ قدرت دونوں کے برخلاف ہے۔ تمام انسان آزاد اور یکساں پیدا ہوئے ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ زندگی اور آزادی اور خوشی حاصل کرنے میں یکساں اور غیر قابلِ انتقال استحقاق رکھتے ہیں۔

حکماء اور انبیاء کی روش

انسان کی بدبختی سے کوئی نسل اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ غلامی کی مصیبت انسانوں میں نہ رہی ہو۔ بہت عقلمند و دانا اور حکیم گذرے۔ بہت سے صاحبِ شریعت گذرے۔ مگر بجز ایک کے اور کسی نے غلامی کا جو قانونِ قدرت کے خلاف ہے کچھ تدارک نہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس کو جائز ہی رکھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کی نسبت ایک حرف بھی نہ کہا۔ یونانی حکیموں نے از روئے اصولِ اخلاق حالتِ غلامی کی نسبت کوئی اعتراض ہی نہیں سمجھا۔ ارسطو باوصف دانائی کے یہ سمجھا کہ خود خدا نے انسانیت کو آزادی اور غلامی میں تقسیم کیا ہے اور جس کو غلام بنایا جاتا ہے وہ ایک قسم ہی جدا ہے۔

افلاطون اس سے زیادہ غلطی میں گرا جب اس نے یہ کہا کہ صرف یونانی غلام نہ ہونے چاہئیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ایک فیاض شخص محمد رسول اللہ صلعم کا اصولِ مقررہ جس نے آیندہ غلامی کی جڑ کو کاٹا اور موجودہ غلاموں کی حالت کو سنوارا اور جہاں تک ممکن ہوا ان کو آزادی کا خلعت پہنایا، ایسا غفلت میں پڑا رہا کہ بہت ہی کم اس پر خیال ہوا۔

عالمگیر برائی غلامی ساری دنیا میں پھیل گئی تھی۔ ہر معاشرہ میں اس کا رواج تھا اور معاشری نظام کے لیے غلامی ناگزیر خیال کی جاتی تھی۔ سرسید نے غلامی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ غلامی اس طرح شروع ہوئی کہ وحشی قوموں نے اپنے قیدیوں کو بجائے مار ڈالنے کے غلامی کی حالت میں رکھنا زیادہ مفید سمجھا اور اس سبب سے دو طریقے غلامی کے رائج ہو گئے۔ ایک تو وہ لوگ جو لڑائی میں قید ہوتے تھے اور دوسرے وہ لوگ جو دغا فریب یا دزدی سے قید کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور متعدد طریقے بھی رائج ہو گئے۔ یہودیوں کے ہاں غلامی قانوناً جائز تھی۔ ایرانی بھی بموجب اپنے قانون کے غلام رکھتے تھے۔ یونانیوں میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی۔ ان کی مختلف قسمیں تھیں اور ان غلاموں کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی۔ رومیوں میں بھی غلامی تھی۔ جو لوگ لڑائی میں قید ہوتے تھے یا جو خود اپنے آپ کو بیچ ڈالتے تھے غلام سمجھے جاتے تھے اور غلام کو سزا دینے یا قتل کر دینے کا لامحدود اختیار آقا کو حاصل تھا۔ ہندوؤں میں غلامی جائز تھی۔ اور جنگی قیدی، قحط سالی میں امداد حاصل کرنے والے محتاج، قرضہ لینے والے لوگ، کسی جرم میں سزا پانے والے مجرم اور فروخت کیے جانے والے بچے غلام بنا لیے جاتے تھے۔ اور ان کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی۔ دھرم شاستر کی رو سے غلام مثل مویشی کے آقا کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اور ان کو دو پائے [illegible] دیا گیا ہے۔ ہندوؤں میں غلاموں کی ایک اور قسم [illegible]

غلام بھی تھے۔ اور یہ بھی موروثی غلام ہوتے تھے۔ مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ دنیا میں غلامی کا نشان باقی نہ رکھتے۔ اور غلاموں کی آزادی کا فرمان جیسا کہ اصول مذہبِ اسلام سے پایا جاتا ہے دنیا میں جاری کرتے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ سب سے زیادہ اندھیرے میں پڑے ہیں اور باوجودیکہ اس زمانہ میں تمام ملک روشن ہو گئے ہیں مگر اسلامی عملداریاں اب تک اسی تاریکی اور اندھیرے میں ہیں۔

اگرچہ عیسائی مذہب نے کچھ بھلائی غلاموں کے حق میں نہیں کی تھی مگر بلاشبہ عیسائیوں نے ان کے حال پر رحم کیا اور یہ نیکی اور بلند نامی انھوں ہی نے حاصل کی۔ جسٹینین نے غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہونے میں بڑی کوشش کی۔ جب امریکہ دریافت ہوا تو عیسائی قوموں میں غلامی کے معاملے میں بڑی گرم بازاری ہوئی اور انگریزوں نے حبشی غلام لاکھوں کی تعداد میں امریکہ بھیجے۔ لیکن اس زمانے میں بھی انگلستان میں یہ قانون تھا کہ اس سرزمین پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی غلام آزاد ہو جاتا تھا۔ چنانچہ رحیم، نیک دل اور انسان کی بھلائی چاہنے والے انگریزوں نے غلاموں کی تجارت موقوف کرنے کی کوشش کی۔ اور آخرکار یہ تجارت موقوف کرنے کے قانون منظور ہوئے اور پھر موجودہ غلاموں کی آزادی کا قانون بنا۔ اس کے بعد فرانس والوں نے بھی غلاموں کو آزاد کر دیا اور امریکہ میں تو غلاموں کی آزادی کے لیے لڑائی بھی ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس باب میں مسلمانوں نے کیا عزّت کمائی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں دین و دنیا دونوں کا خسران مسلمان گورنمنٹوں کو نصیب ہے۔ اب بجز مسلمان ملکوں کے اور کہیں غلاموں کی تجارت جاری نہیں ہے۔ ہم نے جو دین و دنیا دونوں کا خسران مسلمان گورنمنٹوں کی نسبت منسوب کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبِ اسلام کے مطابق غلاموں کی تجارت اور بردہ فروشی میں ایک تو یہ گناہ ہے اور دوسرا گناہ عظیم یہ ہے کہ غیر قومیں

اسلام پر طعنہ مارتی ہیں اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں کیوں کہ وہ ان مسلمان گورنمنٹوں کے افعال سے یہ غلط نتیجہ نکالتی ہیں کہ مسلمانی مذہب میں یہ باتیں جائز ہیں۔

اسلام پر غلط الزام

اسلامی دنیا کے علماء کا فرض تھا کہ اسلام پر جو غلط الزام عائد کیا جاتا تھا اس کی تردید کرتے۔ اور عیسائی مشنری جو اسلام کے خلاف یہ پروپگنڈا کر رہے تھے کہ اسلام نوعِ انسانی کا دشمن اور ظلم و بے رحمی کا سرچشمہ ہے اور تہذیب و شائستگی اور انسانیت مذہبِ اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس کا جواب دیا جاتا۔ لیکن ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کے سوا کسی اور قوم میں نصف صدی سے لونڈی غلام بنانے کا دستور باقی نہ تھا مسلمان ملکوں کی حکومتیں غلامی کے انسداد پر توجہ نہ کرتی تھیں اور خود علماء کا ایک بڑا طبقہ اس ناجائز اور ناشائستہ رواج کو جائز سمجھتا تھا، عیسائی مشنریوں کے الزام اور پروپگنڈا کا جواب دینا آسان نہ تھا۔ تاہم سرسید نے یہ کام بھی اپنے ذمے لیا۔ اور اپنے رسالہ میں غلامی کے متعلق اسلامی احکام کو اس طرح واضح کیا جو اسلام پر اعتراضات کرنے والے مخالفوں کے علاوہ کج فہم علماء کے لیے بھی مفید ہوا اور وہ اس مسئلہ کو صحیح اسلامی احکام کی روشنی میں دیکھ سکیں۔

اسلام کی انسدادی تدابیر

سرسید نے یہ واضح کیا کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح عرب میں بھی غلامی کی جو رسم جاری تھی اس کو دفعتاً موقوف کر دینا نہ صرف معاشری نظام اور اقتصادی حالات کے لحاظ سے ناممکن تھا بلکہ اس سے اور طرح طرح کے مسائل بھی پیدا ہو جاتے۔ چنانچہ بارہ سو برس بعد یورپ کے بڑے بڑے مدبر بھی اس رسم کو دفعتاً موقوف نہ کر سکے اور انھوں نے بھی پہلے تو آیندہ کی غلامی کو بند کیا اور پھر موجودہ غلاموں کے رفتہ رفتہ آزاد ہونے کی تدبیریں کیں۔ پس اسلام نے

جس طرح شراب خواری کو بتدریج ختم کیا تھا اسی طرح غلامی کو بھی رفتہ رفتہ مسدود کر دیا۔ پہلے تو طرح طرح سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی اور اس کو تمام دنیا کی نیکیوں سے افضل بتایا۔ پھر ان کو آزاد کرانے کی مؤثر اور قابلِ عمل تدبیریں اختیار کیں۔ اور اس کے ساتھ ہی آیندہ کی غلامی کا انسداد فرما دیا۔

اس ضمن میں سرسیّد نے یہ دعویٰ بڑی شد و مد سے کیا کہ لڑائی کے قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کا کوئی حکم قرآن مجید کی کسی آیت میں یا کسی حدیث صحیح میں نہیں ہے۔ علماء جن آیتوں اور حدیثوں سے لونڈی غلام بنانے کی تائید میں مطلب نکالتے تھے سرسید نے ان پر بحث کر کے یہ ثابت کیا کہ ان سے استرقان کا حکم مستنبط نہیں ہوتا اور جن الفاظ سے عہدِ رسالت میں لونڈی غلاموں کا ہونا معلوم ہوتا ہے وہ ان سے متعلق ہے جو آیۂ منّ و فداء (سورۂ محمّد) نازل ہونے سے پہلے عرب کی قدیم رسم کے مطابق مختلف طریقوں سے لونڈی غلام بنا لیے گئے تھے اور مسلمانوں کے پاس موجود تھے۔ یہ آیت اُترنے کے بعد آیندہ کے لیے لونڈی غلام بنانے کی ممانعت ہو گئی۔ اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ لڑائی کے قیدیوں کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ زمانۂ جاہلیت میں جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے، لونڈی غلام بنا لینے اور فدیہ لے کر یا احسان رکھ کر چھوڑ دینے کا طریقہ رائج تھا۔ یہ حکم آ جانے کے بعد آں حضرتؐ نے قیدیوں کو قتل کرنے یا لونڈی غلام بنانے کا طریقہ موقوف کر دیا اور یہ اختیار دیا کہ ان کو احسان رکھ کر یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ عہدِ رسالت میں پھر کسی کو لونڈی یا غلام نہیں بنایا گیا۔ اس طرح سرسید نے یہ بتلایا کہ اسلام نے رفتہ رفتہ مؤثر اور قابلِ عمل تدبیریں اختیار کر کے غلامی کا مکمل طور پر انسداد کر دیا۔ اور اگر مسلمانوں نے آگے چل کر اس کو پھر اختیار کر لیا تو اس کی ذمہ داری ان مسلمانوں پر ہے، اسلام پر نہیں۔ اس لیے اسلام کو غلامی کا حامی قرار دے کر اس کے خلاف پروپگنڈا کرنا درست نہیں ہے اور جو مسلمان غلامی کو برقرار رکھنے کی حمایت کرتے ہیں ان کا یہ

فعل اسلام کے خلاف ہے اور اس سے اسلام کی بدنامی بھی ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بردہ فروشی سرسید نے غلامی کے خلاف یہ جدوجہد اس لیے کی کہ ایسے زمانے میں جب کہ ساری دنیا میں یہ بُری رسم موقوف کردی گئی تھی صرف اسلامی ملکوں میں غلامی کا طریقہ جاری تھا۔ اور عرب میں جو مسلمانوں کا روحانی مرکز ہے نہایت بے رحمی سے گائے بیل کی مانند لونڈی غلام بازار میں بکتے تھے۔ اور دُنیا مسلمانوں کو ذلّت وحقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی، جہاں انگریزوں کی حکومت تھی اور غلامی کے انسداد میں انگریزوں نے سب سے زیادہ حصّہ لیا تھا، بردہ فروشوں کی بے رحمی اور انسانیت دشمنی کے باعث لونڈیوں اور غلاموں کو بیچنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اور امیر گھرانوں میں باندیاں رکھنے کا رواج تھا۔ چنانچہ سرسید نے انگریزی حکومت کو بھی اس طرف توجہ دلائی کہ ہندوستانی ریاستوں میں بردہ فروشی جاری ہے۔ اور گورنمنٹ کچھ کافی تدبیر اس کے لیے نہیں کرتی۔ بعض دفعہ خود انگریزی عملداری میں بردہ فروشی ہوتے یا لونڈی اور غلام لانے کا شبہ ہوتا ہے جب کہ ہم کسبیوں کے ہاں نئی نئی نوچیوں کا اور ہیجڑوں کے ہاں نئے نئے چیلوں کا اور نوابوں کے ہاں نئے نئے خواجہ سراؤں کا آنا سنتے ہیں تو دل سے کہتے ہیں کہ ان سب باتوں کا گناہ اب تک انگریزی حکومت کے سر پر ہے۔ موجودہ قانون ان امورات کے تدارک کے لیے کافی نہیں ہیں مگر امید ہے کہ کسی دن یہ رسم بد ہندوستان سے بالکل موقوف ہوجائیگی۔

تعدّدِ ازواج

تمدن ومعاشرت کی ایک اور اہم خرابی جو مسلمانوں میں اسلامی احکام سے انحراف کے باعث رائج ہوگئی تھی اور جس کو دور کرنا معاشرہ کی ترقی واصلاح کے لیے ضروری تھا مسلمانوں کی ازدواجی زندگی کو درست کرنے کے متعلق تھا

مسلمانوں میں تعدد ازواج کے غلط رواج نے بڑی خرابیاں پیدا کر دی تھیں جن سے عائلی زندگی اور عورتوں کے حقوق بُری طرح متاثر ہوتے تھے۔ انسانی معاشرہ میں بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ناپسندیدہ چیزوں اور ناگزیر بُرائیوں کو بدرجۂ مجبوری اختیار کر لیا جاتا ہے۔ تعدد ازواج بھی معاشری زندگی کی وہ خرابی ہے جس کو مخصوص حالات میں مجبوراً برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے بھی نہایت کڑی شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے بعض طبقوں نے اس مشروط اجازت اور ناگزیر بُرائی کو غلط طور سے مردوں کا ایک امتیازی حق سمجھ لیا۔ اور اس غلطی کی وجہ سے ازواجی زندگی نے ایسی افسوس ناک شکل اختیار کر لی جو اسلامی احکام کی روح اور مقصد کے بالکل برعکس تھی اور جس سے مسلمانوں کی عائلی اور معاشری زندگی میں کئی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

ناگزیر معاشری خرابی ہندوستانی مسلمانوں میں بھی کئی بیویاں رکھنے کا رواج تھا اور سرسید اس کو ہندوستانی معاشرہ کی بدترین بُرائیوں میں شمار کرتے تھے۔ چنانچہ اس خرابی کو درست کرنے کے لیے اُنھوں نے خود بھی جدوجہد کی اور ملک کے بااثر اور ذی وقار لوگوں کو بھی یہ بُرائی دور کرنے کے لیے اپنے اثرات سے کام لینے پر متوجہ کیا۔ تعدد ازواج اور طلاق معاشری خرابیاں تو ہیں لیکن خاص حالات میں ان کو اس لیے گوارا کیا جاتا ہے کہ اگر ان کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے تو معاشرہ میں دوسری خرابیاں پیدا ہو جائیں گی جو ان خرابیوں سے بھی زیادہ نقصان رساں ہوں گی۔ اس مجبوری کے پیشِ نظر مکمل امتناع تو مناسب نہیں ہے لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ یہ خرابیاں حدِ اعتدال سے بڑھنے نہ پائیں۔ اس چیز کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نہ صرف اسلام بلکہ یہودیت اور عیسائیت اور بُت پرست مذاہب نے بھی تعدد ازدواج کو ممنوع نہیں کیا۔ جو لوگ عقلی یا اخلاقی یا تمدنی لحاظ سے تعدد ازواج یا

طلاق کے جائز ہونے پر اعتراض کرتے ہیں ان کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اگر ایک زوجہ کے سوا دوسری زوجہ کرنے کا امتناع ہو اور بجز زنا کے اور کسی حالت میں طلاق دینا جائز نہ ہو تو معاشرہ کی اخلاقی حالت کیا ہوگی۔ اور عائلی زندگی کس قدر تلخ ہو جائے گی۔ جب دو صورتیں ہوں تو وہ صورت اختیار کرنی چاہیے جس سے ممکنہ حد تک اخلاقی اور تمدنی نقصان کا انسداد ہو سکے۔ اسلام نے اس بارے میں ایک متوسط درجہ اختیار کیا ہے۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ اس سے تمام نقصانوں میں اور بالخصوص اخلاقی نقصان میں بہت کمی ہو گئی ہے۔

اسلام کی عائد کردہ پابندی

اس مسئلہ پر مذہبی حیثیت سے بحث کرتے ہوئے سرسید نے یہ واضح کیا کہ تعدد ازواج کو جس خوبی سے اسلام نے روکا ہے اس طرح نہ یہودیوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے۔ اسلام نے تمام مذاہب سے بہتر طریقہ پر اور سب سے بڑھ کر تعدد ازواج کا انسداد کیا ہے۔ اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے۔ اور تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ اس بارے میں مذہب کا صحیح اصول یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرتِ ازواج کی ممانعت ہو اور صورت ہائے خاص اور حالاتِ مستثنیٰ میں اجازت ہو۔ اور بالکل یہی اصول اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملے اور دقیق اور پُرپیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں اس طرح بیان کر دیا ہے۔ "فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً" یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد بیویوں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی بیوی رکھنی چاہیے۔ اگر اس آیت کے وہی معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہاء اور علماء نے لیے ہیں تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازواج کو گویا بالکل روک دیا ہے۔ کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط ہو جرأت نہیں کرے گا۔

اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھیرا دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں کہا کہ اِنْ لَمْ تَعْدِلُوْا (اگر تم عدل نہ کر سکو) بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا (اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے) پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو بھی عدل نہ کر سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کی یہ آیت وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَاءِ یعنی "تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو" سرسید کے نزدیک اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ متعدد بیویوں میں عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے اس کو کچھ مستثنیٰ صورتوں کے سوا متعدد بیویاں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسلمانوں میں بُرا رواج

ان خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے بیان کر کے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا منشا ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے، ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کی بے جا عمل درآمد کرنے سے یہ لوگ اس خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرمِ راز ہے۔ اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہو گی۔ جو تعدد ازواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو تین تین اور چار چار جورو ئیں کرنے لگے۔ اور ایک بازار کی عورت کو داؤں پر چڑھایا اور نکاح کر لایا۔ جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے سانڈ بنے۔ اس مریدنی کو لے ڈالا۔ وہاں وعظ کہنے لگے اور سنتِ نکاح کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے۔ اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے [illegible] شروع کر دیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ

تعلق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے۔ اور یہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ تعدد ازواج کی بُری رسم کی وجہ سے مذہب کی جو بدنامی ہوتی تھی اور اس کی بدولت معاشری زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں ان کو دور کرنے کے لیے سرسید نے اس بُری رسم کو مٹانا معاشرہ کی اصلاح کے لیے ضروری قرار دیا اور اس کے لیے ممکنہ جدوجہد کی۔

یتیم اور لاوارث بچّوں کا مسئلہ

اس زمانے کا ایک اور توجہ طلب معاشری مسئلہ یتیم اور لاوارث بچّوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ تھا۔ ہندوستان میں قحط کی بلا اکثر آتی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے صغیر سن بچے یتیم و لاوارث ہو جاتے تھے۔ حکومت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسے تمام بچّوں کی پرورش کرتی اس لیے وہ ان بچوں کو ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی تھی۔ جو ان کی پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری قبول کرتے۔ ہندوستان کی معاشری حالت خراب تھی اور ان کو اپنی معاشری ذمہ داریوں کا احساس بھی نہ تھا۔ اس لیے عیسائی مشنری اس سے پورا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ان کے پاس کثیر دولت تھی جو وہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جمع کرتے تھے اور اُنھوں نے تعلیم و تربیت کا معقول انتظام بھی کیا تھا یتیم و لاوارث بچّے عموماً مشنریوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے اور وہ ان کو عیسائی بنا لیتے تھے۔ قحط کی وجہ سے یتیم اور لاوارث بچّے اس کثرت سے عیسائی بنا لیے گئے کہ ان سے گاؤں کے گاؤں آباد ہو گئے۔ سرسید کو اس پر اعتراض نہ تھا کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے عیسائی مذہب قبول کرلے۔ لیکن وہ اس چیز کو قابلِ نفرت سمجھتے تھے کہ صغیر سن بچّے جو کسی مصیبت کی وجہ سے یتیم و لاوارث ہو جائیں ان کی اس حالت سے فائدہ اُٹھا کر ان کا مذہب بدل دیا جائے اور

وہ اپنی قوم، برادری اور رشتہ داروں سے جیتے جی مثل مُردوں کے الگ ہو جائیں اور اس خوشی سے محروم رہیں جو اپنی قوم میں شامل اور اپنے عزیزوں سے قریب رہنے سے ہوتی ہے۔

سرسید کا یہ خیال تھا کہ صغیر سن بچوں کو مصیبت کی حالت میں عیسائی کر لینا رحم اور انسانیت اور نیکی اور نیک دلی سے بعید ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ ہرگز یتیم بچوں پر رحم نہیں کرتے بلکہ خود غرض متصور ہوتے ہیں۔ اور درحقیقت یتیم بچوں پر ان کی بے کسی کی حالت میں ظلم کرتے ہیں۔ کوئی مسلمان یا ہندو اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا کہ یتیم یا لاوارث بچے ہندو یا مسلمان کے ایسی بے رحمی سے عیسائی بنائے جائیں۔ چنانچہ سرسیّد نے یہ اپیل کی کہ "میں نہایت عجز و انکسار اور دلی جوش حب وطنی سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ خدا کے واسطے، رام جی کے واسطے اپنی قوم کے یتیم اور لاوارث بچوں پر رحم کرو۔ اور ان کی پرورش کے لیے ان تدبیروں میں میرے ساتھ شریک ہو جو مدّت ہائے دراز سے میں نے سوچی ہیں۔"

سرسیّد کی تجاویز سرسید نے ان بچوں کے لیے یہ اسکیم بنائی تھی کہ ضلع علی گڈھ میں زمین لے کر وہاں یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش کے لیے مکانات بنائے جائیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے بچوں کی پرورش کے لیے ان مکانوں میں مناسب انتظام کیا جائے۔ پرورش اس طرح پر ہو کہ کسی بچّے کی ذات اور مذہب میں فرق نہ آنے پائے۔ اور مختلف مذہبوں اور ذاتوں کے مرد اور عورتیں پرورش کے کام پر مامور ہوں۔ پرورش گاہ سے متصل مکتب ہو جہاں تعلیم دی جائے۔ اور دری بافی، قالین بافی، نجاری، لوہاری جیسے مختلف پیشے سکھانے کے لیے کارخانے ہوں تاکہ یہ لڑکے اس پرورش گاہ سے نکلنے کے بعد روزی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت اور دستکاریاں سکھانے کا معقول

انتظام ہو۔ اور جب یہ لڑکیاں جوان ہو جائیں تو ان کے بیاہ کا مناسب انتظام کیا جائے تاکہ وہ نیکی اور نیک بختی سے زندگی بسر کر سکیں۔ ان پرورش گاہوں کے انتظامات کے لیے کمیٹی بنائی جائے جس میں ہندو اور مسلمان سب شریک ہوں۔ سب لوگ اس کے لیے چندہ دیں۔ اور زمیندار وغیرہ غلہ، لکڑی، برتن جیسی چیزیں دے کر مدد کریں۔ جب یہ یتیم خانے مستقل ہو جائیں تو حکومت سے یہ درخواست کی جائے کہ ہم نے ایسی پرورش گاہیں قایم کر لی ہیں جہاں یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش ان کے مذہب کے مطابق کی جاتی ہے، ان کو مناسب تعلیم دی جاتی ہے اور مفید ہنر سکھائے جاتے ہیں اس لیے آیندہ سے یتیم اور لاوارث بچے پادری صاحبان کی بجائے ہمارے سپرد کیے جائیں۔ گورنمنٹ کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ یتیم بچے بہرحال عیسائی بنائے جائیں اس لیے یہ یقین ہے کہ حکومت اس درخواست کو منظور کرے گی اور یتیم و لاوارث بچوں کو پادریوں کے سپرد کرنے کا طریقہ بند ہو جائے گا۔[۵]

وراثت کا مسئلہ

مسلمانوں کی معاشی حالت کو درست کرنا اس زمانے کا ایک اہم ترین مسئلہ تھا۔ سرسید اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور جو خاندان امیر اور ذی مقدور تھے ان کی اولاد نہایت غریب و مفلس ہو گئی ہے اور جو باقی ہیں دو پشت میں ان کی جائدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر قرضے میں بک جائیں گی۔ اس لئے ان کو یہ خیال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے مسلمانوں کی ریاستیں قائم رہیں اور مسلمانوں میں رئیس و ذی مقدور لوگ بھی دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی سرسید یہ بھی چاہتے تھے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو تدبیر اختیار کی جائے

[illegible] سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کی فقہ کے مطابق ہو اور دونوں کے مسائل مسلمہ مذہب کے برخلاف نہ ہو۔

وراثت اور وصیت سرسید کا یہ خیال تھا کہ وراثت کا مسئلہ بموجب شرع کے ایسا مستحکم ہے کہ کوئی مسلمان اس کی بجا آوری سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور کوئی شخص اس میں دست اندازی کا مجاز نہیں۔ جائداد کے مالک کو زمانۂ حیات میں از روئے شرع جائداد کی نسبت اختیارِ کامل ہوتا ہے۔ چاہے وہ اس کو بیع کر ڈالے۔ چاہے کسی کو بخش دے۔ چاہے وقف کرے اور چاہے ایک ثلث کی پابندی قواعد شرع وصیت کرے۔ وصیت کا مسئلہ بھی قریب قریب وراثت کے مسئلے کے ہے۔ یعنی کسی شخص کو ثلث مال سے زیادہ وصیت کا اختیار نہیں ہے اور نہ ذوی الفروض کے حق میں اس کو وصیت کرنے کا اختیار ہے۔ یہ مسئلہ بھی مثل مسئلہ وراثت کے ایسا ہے کہ نہ اس میں کوئی دست اندازی کر سکتا ہے اور نہ اس سے انکار کر سکتا ہے۔

جائداد وقف کرنیکے فوائد وراثت اور وصیت کے مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرسید نے اس بات کو واضح کیا کہ وقف کا مسئلہ جس کا اختیار مالک کو بموجب شرع کے اپنی حیات میں حاصل ہے ایک قابلِ غور مسئلہ ہے شیعہ اور سنی دونوں فرقوں کی فقہ کی کتابوں میں وقف دو قسم کا قرار دیا گیا ہے۔ ایک وقف تو امورات مذہبی کے لیے اور دوسرا وقف اہل و عیال کی پرورش کے لیے۔ اس دوسری قسم کے وقف کے لیے فقہ کی کتابوں میں جداگانہ ابواب اور جداگانہ احکام مندرج ہیں۔ چنانچہ ان کا حوالہ دے کر سرسید نے یہ واضح کیا کہ شیعہ و سنی، دونوں کی فقہ کی رو سے ہر شخص کو یہ اختیار ہے کہ اپنی جائداد کو اپنے لیے اور اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیے وقف کر دے۔ اس طرح پر جائداد کے وقف

کرنے سے بموجب شرع کے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ جائداد نہ بیع ہو سکتی ہے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ ہمیشہ قائم و برقرار رہتی ہے۔ اہلِ خاندان میں سے ایک شخص اس قاعدے اور ترتیب سے جو مالکِ جائداد نے مقرر کیا ہو یکے بعد دیگرے جائداد پر بطور جانشین یا متولی کے قابض ہوتا ہے۔ اور اس کی آمدنی میں سے بموجب اس طریقہ و مقدار کے جو مالک نے قرار دیا ہو خود بھی لیتا ہے اور بقیہ ان لوگوں کو اس طریقہ و مقدار سے دے دیتا ہے جو مالکِ جائداد نے بروقتِ وقف قرار دیا ہو۔ اس طریقہ میں بڑی عمدگی یہ ہے کہ مالکِ جائداد اپنی زندگی تک جائداد کی آمدنی لینے اور خرچ کرنے کا مجاز رہتا ہے اور اس کی وفات کے بعد جانشین یا متولی کے قبضے میں جاتی ہے۔ مگر وقف کرنے کے بعد خود واقف کو بھی اس جائداد کو منتقل کرنے کا حق نہیں رہتا۔

سرسید کی تجویز امیر اور ذی مقدور خاندانوں کی جائدادوں کو تباہی سے بچانے کے لیے سرسید نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان اپنی جائداد اور اپنی ریاست کو وقفِ خاندانی کرنے کا طریقہ اختیار کریں۔ کیونکہ اس طرح جائداد ہمیشہ کے لیے قائم و موجود رہے گی اور کوئی شخص اس کو تلف نہ کر سکے گا اور جو جائداد اس طرح وقف ہوگی اس میں وراثت جاری نہ ہو سکے گی یعنی تقسیم نہ ہوگی بلکہ ہمیشہ بلا تقسیم بطور ریاست قائم و غیر منقسم رہے گی جس ترتیب اور قاعدے سے مالکِ جائداد قرار دے گا اسی قاعدے اور ترتیب سے کوئی شخص، مثلاً بڑا بیٹا بطور متولی جانشین ہوگا اور جائداد کی آمدنی میں سے جن جن لوگوں کو مالکِ جائداد نے دینا تجویز کیا ہوگا اسی طرح پر دیتا رہے گا۔

سرسید کے نزدیک شرع کی رو سے صرف یہی ایک طریقہ جائداد و ریاست کے محفوظ و قائم رکھنے کا تھا اس لیے انھوں نے قانونِ جائداد موقوفہ خاندانی اہلِ اسلام کے نام سے ایک قانون کا خاکہ تیار کیا اور امیر و ذی مقدور مسلمانوں کو

اس کی مجوزہ دفعات پر غور کرنے کی دعوت دی۔ تاکہ حکومت کے سامنے خاندانی قانون بنانے کی تجاویز پیش کر کے اس کو اس ضروری اور اہم مسئلہ پر متوجہ کیا جائے۔ اور مسلمان خاندانوں کی ریاستیں اور جائدادیں جو روز بروز برباد ہو رہی تھیں وہ بربادی سے بچیں اور ہمیشہ قائم رہیں۔

بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کا مسئلہ

ہندوستانی معاشرہ میں جو خرابیاں پوری توجہ اور اصلاح کی مستحق تھیں ان میں بیوہ عورتوں کے نکاح نہ کرنے کا عام رواج بھی شامل تھا۔ ہندو اس بارے میں بہت سخت تھے اور بیوہ کی شادی کر دینا خلافِ مذہب اور انتہائی بے عزتی کی بات خیال کرتے تھے اور ان کے زیر اثر مسلمانوں میں بھی یہ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ سرسید یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ خرابی معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والی ہے اور اس کو دور کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بیوہ عورتوں کے نکاح کی ضرورت پر بہت زور دیا اور یہ بتلایا کہ معاشرہ کو کئی خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ کس قدر ضروری ہے۔

عام رواج کے نقصانات

سرسید نے یہ واضح کیا کہ جو خرابیاں بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ صرف شریعت کے ہی خلاف نہیں اور وہ ان کے عزیز مذہب کی روشن پیشانی پر ہی سیاہ ٹیکہ نہیں لگاتیں بلکہ اس کی دنیا کی عزت میں بھی نہایت خلل آتا ہے اور سچ پوچھو تو انسانیت ہی میں خلل آتا ہے۔ فرض کرو کہ بعض بیوقوف یا بداعتقاد آدمی یہ خیال کر لیں کہ عقبیٰ میں ہم سے کچھ مواخذہ نہ ہوگا تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ بداعتقادی کا ایسا خیال اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے عقبیٰ کی رسوائی کو آنکھ سے نہیں دیکھا اس لیے وہ نڈر ہیں۔ مگر اس دنیا کی ذلت سے دنیادار بہت ڈرتے ہیں صریح احمقوں کو نصیب ہوتی ہے اور باایں ہمہ وہ

اس سزائے ظاہری سے نہیں شرماتے۔ کیا وہ حقیقت میں انسان نہیں ہیں کہ عبرت پکڑیں؟ اور اگر انسان ہیں تو کیا خدا نے ان کے دماغ میں جوہر عقل بالکل نہیں رکھا جو وہ مثل وحشیوں کے غیرت کے مفہوم کو ہی نہیں سمجھتے؟ اور اگر عقل بھی ہے تو کیا وہ بے حیا اور بے شرم ہیں جو ایسی رسوائیوں کے بعد بھی نہیں سمجھتے؟ اور اگر وہ بے حیا بھی ہیں تو کیا اس بے حیائی سے زندگی بسر کرنے میں ان کو کوئی ایسا لطف آتا ہے جس کو وہ باایں ہمہ رسوائی اور ذلت نہیں چھوڑتے؟ کیا وہ اپنے ہم جنس کے ساتھ ہمدردی کرنا عیب سمجھتے ہیں جو وہ اپنی عزیز عورتوں کو ایسی مصیبت میں پھنساتا پسند کرتے ہیں؟ کیا ان کو ذرا بھی اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ ان کی بیوہ عورتیں بچہ کشی کے جرم میں ماخوذ ہو کر پھانسی یا دائم الحبس ہونے کی سزا پائیں اور وہ آنکھوں سے دیکھیں۔ عجب عزت ہے اس قوم کی جو اس رسوائی سے نکاح ثانی کی رسوائی کو زیادہ جانتے ہیں اور اپنی نادانی سے نکاح ثانی کو عیب سمجھتے ہیں۔"

شولاپور کے ایک مقدمہ کی روداد اور فیصلے کا حوالہ دے کر سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ایک نوجوان عورت کا چھوٹی عمر سے مصیبت میں گرفتار رہنا اور بے چاری کا اپنی جان کو تباہ کرنا اور اگر ضبط نہ ہو سکے، بلکہ بمقتضائے بشریت گناہ کرے تو اس کے بعد رسوا ہونا اور اگر بچہ پیدا ہوا اور وہ اس کو غیرت یا شرم سے مار ڈالے تو پھر ایک شریف کی لڑکی کا تھانے میں جانا اور سپاہیوں کے ہاتھ سے بے عزت ہونا اور پھر مجسٹریٹ کے روبرو علی الاعلان زناکاری اور بچہ کشی کا اقرار کرنا اور اس کے بعد پھانسی پر لٹکنا اور اگر دائم الحبس ہوئی تو تمام عمر جیل خانوں کے قبضے میں رہنا ہزار درجے بدتر ہے اس سے کہ اس کی شادی ہو جائے۔ پس وہ عزت دار صاحب جو بیوہ عورت کے نکاح ثانی کو موت سے زیادہ سمجھتے ہیں اور اپنی نہایت نازک ناک کو تھامے پھرتے ہیں کیا وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قدر بے انتہا ذلتیں اچھی ہیں یا ایک نکاح کی وہ ذلت اچھی ہے جس کو وہ [illegible] ذلت سمجھتے ہیں۔"

اصلاح کی ضرورت اس معاشری خرابی کو دور کرنے کے لیے سرسیّد نے ایک کمیٹی بنانے کی تجویز پیش کی اور تعلیم یافتہ اور قومی ہمدردی رکھنے والے لوگوں کو اصلاح کے اس اہم کام میں پہل کرنے کی ضرورت پر متوجہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کی مخالفت میں جو جاہل ہندوستانیوں نے ایک ضد کر رکھی ہے اس کے سبب سے ہندوستان میں بہت بڑی بداخلاقی پھیلی ہوئی ہے۔ اور اس کے ثمرات اور نتائج سے نہایت بڑی بڑی ذلتیں نصیب ہو چکی ہیں اور ہمیشہ ہوتی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس کے تدارک کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ جس طرح ہمارے زمانے کے مہذّب اس بے ہودہ رواج کی بُرائی کو جانتے ہیں اور جس قدر اس سے دلی نفرت کرتے ہیں اس قدر عملی کوشش سے اس کے انسداد میں سرگرم نہیں ہوتے اور ہر شخص اپنی قوم میں اس بات کا منتظر ہے کہ پہلے دوسرا شروع کرے۔

طریقۂ زندگی

ہندوستانی طرزِ معاشرت میں کچھ ایسی خرابیاں تھیں جن کی اصلاح کرنا ضروری تھا۔ رہنے سہنے کے طریقوں میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو وحشیانہ زمانہ سے چلی آتی ہیں۔ مہذب اور ترقی یافتہ قوموں نے ان طریقوں کو بدل دیا۔ لیکن غیر ترقی یافتہ لوگوں میں یہ اب تک جاری ہیں۔ تمدّن و معاشرت میں اصلاح و ترقی کے لیے سرسید نے زندگی اور رہن سہن کے ان طریقوں کو بدلنے پر زور دیا جو بدستور وحشیانہ طور پر برتے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کو یہ بتلایا کہ قوموں کے طریقۂ زندگی سے ان کی عزّت یا ذلّت ہوتی ہے۔ تربیّت یافتہ قوموں نے غیر مہذب طریقوں میں تراش خراش کر کے ان کو نہایت دلکش اور فرحت بخش بنا لیا ہے۔ تربیت یافتہ قومیں بدستور غیر مہذب طریقوں پر چل رہی ہیں۔ اور اسی

لیے مہذب قومیں ان کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے کہ بہ سبب نہ ہونے فن و ہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقہ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا وہ اس زمانے میں حقیر نہ تھا۔ مگر حال کے زمانے میں ذلیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس قدر فن و ہنر و صنعت کاری نکلتی آئی اسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز و سامان سے اپنا طریقۂ زندگی آراستہ کر لیا۔ اور جنھوں نے ایسا نہ کیا وہ ویسے ہی حقیر و ناتربیت یافتہ رہیں۔

طرزِ معاشرت کا اثر "طریقہ زندگی سے قوموں کی ذلت اور عزت کا ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں کنجڑوں کی قوم کو دیکھو جو ایک لنگوٹی باندھے رہتی ہے۔ اور نہایت میلا بدن اور نجس ہاتھ پاؤں رکھتی ہے۔ اور نہایت میلے بدبودار برتن استعمال میں لاتی ہے۔ غذا بھی ان کی نہایت کثیف ہوتی ہے اور کھانے کا طرز بھی ایسا برا ہے جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ پس یہ قوم صرف اپنے طریقۂ زندگی کے ذلیل ہونے کے سبب ہماری آنکھ میں کیسی ذلیل ہے۔ ان کی بہ نسبت عام گنواروں کا لباس اور طریقۂ زندگی بدرجہا اچھا ہے اور وہ ہماری نظر میں چنداں ذلیل نہیں۔ ہم کبھی ان کے گھر بھی جاتے ہیں۔ ان کے ہاں کا پانی بھی پیتے ہیں۔ روٹی بھی کھاتے ہیں اور کچھ نفرت نہیں کرتے۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان اور انگریز تین قومیں ہیں جو اپنے تئیں مؤدب و مہذب اور شائستہ سمجھتی ہیں۔ ان تینوں قوموں کا جو طریق لباس اور طرزِ زندگی اور کھانے پینے کی رسم اور اٹھنے بیٹھنے کی عادت ہے اس سے تمام لوگ ہندوستان کے بخوبی واقف ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں جس قوم کا طریقہ اعلیٰ ہے وہ قوم باقی دو قوموں کو ایسا ہی ذلیل، ناتربیت یافتہ اور قابلِ نفرت کے سمجھتی ہے جیسے کہ یہ دونوں قومیں اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتی ہیں۔ مسلمان اپنی دانست میں اپنے لباس اور اپنی مجلس میں نہایت آراستگی اور شان کرنے میں اور اپنے

دسترخوانوں کو طرح طرح کے لذیذ کھانوں سے اور خوبصورت خوبصورت سونے اور چاندی اور چینی اور بلوریں برتنوں سے آراستہ کرتے ہیں۔ مگر جو قوم کہ ان سے بھی زیادہ لباس اور کھانے پینے کے طریق میں زیادہ صفائی رکھتی ہے وہ ان کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں اور ہر دفعہ رکابیاں اور چھری، کانٹے، چمچے بدلتے ہیں جب وہ مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کو کراہت آتی ہے۔ ہم کو اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ چھری اور چمچہ سے کھانا اور ہر قسم کے کھانے کے لیے جدا برتنوں کا ہونا بہ نسبت ہاتھ سے کھانے کے زیادہ عمدگی و صفائی اور نفاست رکھتا ہے۔"

کھانا کھانے کے طریقے

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کھانا کھانے کے جو طریقے تھے ان کو سرسید اصلاح طلب خیال کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ طرزِ معاشرت کی بہتری کے لیے ان طریقوں میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر وضع تبدیل نہ کی جائے تب بھی ان کی خرابی جس حد تک دور ہو سکے وہ کرنی چاہیئے۔ کھانا کھانے کے ان طریقوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ ہندو چوکے میں چھوٹی چھوٹی پالیوں یا تشتریوں یا پتلیوں میں تھوڑا تھوڑا سب قسم کا کھانا چن کر آگے رکھ لیتے ہیں اور ہر ایک میں سے کچھ کچھ کھاتے جاتے ہیں اور جو بچتا ہے وہ اس میں دھرا رہتا ہے۔ جس میں انھوں نے کھایا تھا۔ اور اس سبب سے کھانے کے وقت ان کے سامنے جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا سب رکھا رہتا ہے اور کھا چکنے کے بعد وہ سب اٹھ جاتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے کھانا کھانے کا بھی یہی طریق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ ہندو چوکے میں بیٹھتے ہیں اور مسلمان دسترخوان بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ جس طرح ہندو سب طرح کا کھانا ایک ساتھ اپنے آگے رکھ لیتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی قابوں اور رکابیوں اور غوریوں اور [illegible] پالیوں میں سب طرح کا کھانا اور سب طرح کی روٹی اور ہر طرح

کے کباب اور فیرنی کے خوانچے اور بورانی کے پیالے اور اچار مربہ کی پیالیاں سیتلا کے پوجا پے کی طرح سب اپنے آگے رکھ لیتے ہیں۔

ناشائستہ عادتیں اس طرح ہر قسم کے کھانے اپنے آگے رکھ لینے کے علاوہ کھانے کے طریقے کو سرسید بہت اصلاح طلب خیال کرتے ہیں جس کا نقشہ انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اس طرح کھینچا ہے۔

"اس دسترخوان پر کوئی تو فیرنی کلمۂ شہادت کی انگلی سے اور کوئی بغیر چاروں انگلیوں سے چاٹ رہا ہے۔ کوئی پلاؤ میں اروی کا سالن ملا ملا کر کھا رہا ہے۔ کسی نے سالن ملا ہوا پلاؤ کھا کر نان آبی سے لتھڑا ہوا پنجۂ مبارک پونچھ کر روٹی کو سالن میں ڈبو ڈبو کر کھانا شروع کیا ہے۔ کسی نے بورانی کے پیالے کو منہ سے لگا کر سڑپا بھرا اور یہ کہہ کر واللہ بڑی تیز ہے۔ آوہ! آوہ! کرنا شروع کیا ہے۔ تمام جھوٹے برتن اور نیم خوردہ کھانا اور چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور روٹی کے ٹکڑے اور سالن میں کی نکالی ہوئی مکھیاں سب آگے رکھی ہوئی ہیں۔ اس عرصہ میں جو شخص پہلے کھا چکا ہے اس نے ہاتھ دھونا، کھنکار کھنکار کر گلا صاف کرنا اور بیسن سے دانت رگڑنا اور زبان پر دو انگلیاں رگڑ رگڑ کر زبان صاف کرنا شروع کیا ہے۔ اور دوسرے لوگ بے تکلف بیٹھے کھانا نوش فرماتے ہیں۔ نہ ان ہاتھ منہ دھونے والوں کو خیال ہے کہ ہم کھانا کھانے والوں کے قریب کیسی حرکاتِ ناشائستہ کرتے ہیں اور نہ کھانا کھانے والوں کو ان لوگوں کی کریہہ آواز سننے اور زرد زرد ہلدی کے ملے ہوئے رنگ کا لعاب نکالنے اور بلغم کے لوتھڑے تھوہ کر کے چلمچی یا ناش میں تھوک دینے اور بتاسے کی طرح اس کے پانی پر تیرتے پھرنے کی پرواہ ہے۔ نعوذ باللہ منہا۔"

انگریزوں کا طریقہ کھانا کھانے کا یہ طریقہ یقیناً بہت معیوب اور اصلاح طلب تھا۔ اور سرسید کا [illegible]

انگریزی طریقہ سب سے بہتر ہے جو سب پر روشن ہے لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ اگر چھری کانٹے سے کھانے کا نام لیا تو نیک متبع سنت اہل وطن تشبہ کا چھرا ماریں گے۔ تاہم اُنھوں نے بارہا اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ چھری اور چمچے سے کھانا اور ہر قسم کے کھانے کے لیے جُدا برتنوں کا ہونا بہ نسبت ہاتھ سے کھانا کھانے کے بہت زیادہ عمدگی وصفائی اور نفاست رکھتا ہے۔ چھری کانٹے استعمال کرنے کے جواز میں ان کا یہ بھی استدلال تھا کہ یہ نہ صرف جائز بلکہ سنت ہے۔ کیونکہ خود جناب رسولِ خدا صلعم نے گوشت کو چھری سے کاٹ کر اور اس کی نوک سے اُٹھا کر تناول فرمایا ہے۔ میز پر کھانا کھانے کی تائید میں ان کی دلیل یہ تھی کہ حضور رسول خدا صلعم نے کبھی چپاتی تناول نہیں فرمائی۔ نہ میدے اور روے کی اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائی۔ نہ کبھی تشتریوں اور رکابیوں میں کھانا کھایا۔ اسی طرح اُنھوں نے میز پر بھی کھانا تناول نہیں فرمایا۔ مسلمان جس طرح یہ چیزیں کھا سکتے ہیں۔ اور تشتریوں اور رکابیوں میں کھانا کھاتے ہیں اسی طرح میز پر بھی کھا سکتے ہیں۔

سرسید نے اس پر اصرار نہیں کیا کہ خواہ مخواہ میز کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاؤ۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے کھانے کے طریقے میں جو خرابی اور کراہت ہے وہ دور کی جائے۔ اور صفائی و پاکیزگی کا لحاظ رکھا جائے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ "شوق سے دسترخوان پر کھانا تناول فرماؤ اور گو بہت سے سنن ہدیٰ کے ادا کرنے کی فکر نہ ہو، زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے ہی کی سنت عادی کی پیروی کرو۔ مگر برائے خدا یہ غچلے پن چھوڑ دو۔ جو غچلے پن ہندوستان کے مسلمانوں میں کھانے کی مجلس میں ہوتا ہے، نعوذ باللہ منہا، کسی ملک کے کھانے کی مجلس میں نہیں ہوتا پس نہایت شرم کی بات ہے کہ ہم اپنی ضد اور نفسانیت سے اس [illegible] میں پڑے رہیں اور اس کی درستی و تہذیب پر متوجہ نہ ہوں۔ ہر طرح اور [illegible] کھانے میں جہاں تک اصلاح اور صفائی ہو سکے اس کو اختیار کرنا

ضروری ہے۔"

قومی لباس کی ضرورت

مسلمانوں میں تہذیب و شائستگی کو ترقی دینے اور قومیت کا خیال پیدا کرنے کے لیے سرسید اچھا قومی لباس اختیار کرنے کو بہت اہم سمجھتے تھے جس پر عام مسلمانوں نے کبھی توجہ نہیں کی۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لباس میں امتیاز نہ تھا۔ سرسید کے پیش نظر دوسرے ملکوں کی مثال تھی جہاں ہر قوم کا ایک خاص لباس تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی پارسی اور بنگالی جیسے ترقی پذیر فرقے اپنا الگ لباس رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی قومی یگانگت کے لیے زبان اور مذہب کی طرح ان کے لیے ایک لباس کی بھی ضرورت تھی لیکن ہندوستان میں کوئی ایسا لباس موجود نہ تھا جو مسلمان اپنے قومی لباس کے طور پر اختیار کر لیتے، اس لیے سرسید نے ایک معزز ترین مسلمان قوم یعنی ترکوں کا لباس پسند کیا۔ اور مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اس کو اختیار کر لیں۔ چنانچہ سب سے پہلے تو سرسید نے خود یہ لباس اختیار کیا۔ پھر محمڈن کالج علی گڑھ کے طلباء کے لیے اس کو یونیفارم قرار دینے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس کی مخالفت کی گئی تاہم طلباء میں یہ رفتہ رفتہ مقبول ہونے لگا اور ایک قومی لباس رواج دینے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔

کوئی لباس اسلام کا جزو نہیں

بہت سے لوگ لباس میں اس تبدیلی کے مخالف تھے اور اس کو مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ وہ جو لباس استعمال کر رہے ہیں وہ تو اسلامی ہے۔ لیکن سرسید جس لباس کو اختیار کر لینے کے لیے کہتے ہیں وہ غیر اسلامی ہے اور اس کو پہننے سے کفار سے مشابہت پیدا ہو جائے گی۔ اس غلط خیال کو دور کرنے کے لیے سرسید نے ایک سپاسنامہ کے جواب میں جو جالندھر میں پیش کیا گیا تھا یہ واضح کیا کہ "اگر مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ لباس ایک جزو

کا ہے اور کسی لباس سے اسلام جاتا رہتا ہے یا اس میں کچھ نقص آجاتا ہے تو وہ بالکل غلطی پر ہیں۔ جو لوگ مذہب اسلام کی سچائی پر یقین رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایسی چیز نہیں ہے جو ایسی بیرونی باتوں سے رہے یا جائے۔ وہ لباس سے مذہب کو کچھ بھی نقصان پہنچنا خیال میں نہیں لاتے۔ اسلام ایک نور ہے جو دل میں ہوتا ہے اور جس سے اس نور رکھنے والے کے عقیدے مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ مولی کھانے سے اسلام مضبوط ہو اور انڈہ کھانے سے کمزور ہو جائے۔ جو مسلمان اس وقت موجود ہیں ان سے یہ سوال ہے کہ آیا جن بزرگوں کی ہم پیروی کرتے ہیں رسولِ خدا صلعم، اصحاب کرام، اہلِ بیت علیہم السلام، ان کا یہی لباس تھا جو ہم مسلمان اس وقت پہنتے ہیں۔ یہ تو کوئی بھی نہ کہے گا کہ ہاں یہی تھا۔ اور جب یہ نہ تھا اور ہم نے اس میں کئی طرح کی تبدیلیاں کی ہیں اور آتش پرستوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے لباس سے مل کر ہمارے لباس میں ایک ترکیب دی گئی ہے تو پھر کیا ایسی تبدیلی کرنے والوں کا اسلام باقی نہیں رہا۔ یہ ایک غلط خیال ہے جو مسلمان لباس کی نسبت کرتے ہیں۔ اسلام نے ہم کو کچھ نہیں بتایا کہ ہمارے لباس کی کیا قطع ہونی چاہئے۔ کیا تم ان حدیثوں کو بھول گئے ہو جن میں ذکر ہے کہ عیسائیوں اور مجوسیوں نے اس قسم کے چغے جو ان کے ہاں کے قسیس و رہبان پہنتے تھے اور جن کو حدیثوں میں جبۂ رومیہ کہا گیا ہے آں حضرتؐ کے پاس تحفہ میں بھیجے تھے اور آپ نے ان کو پہنا تھا۔ پس لباس کے لحاظ سے طعن کرنا نعوذ باللہ اس فعل پر ناسمجھی سے طعن کرنا ہے جو آنحضرتؐ نے کیا ہے۔

"اگر مسلمان سمجھتے ہیں کہ لباس کو اسلام میں کچھ دخل ہے تو یہ ایک سخت بدعتِ سیئہ ہے جو اعتقاد اور عمل دونوں میں صادق آتی ہے۔ اور اس بدعت کا دور کرنا ہر ایک مسلمان پر لازم ہے۔ اس لیے سب سے اوّل مقدس مولویوں کو تبدیلی لباس لازم ہے۔ پس اگر مدرسۃ العلوم کے کسی طالب علم نے ترکی

لباس پہنا جو ایک معزز کثیر گروہ مسلمانوں میں رائج ہے تو کوئی وجہ مولویوں کو اس پر اعتراض کرنے کی نہیں ہے۔ یہ وہی تاریک خیالات ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اس حال پر پہنچایا اور ذلت میں ڈال دیا۔ اگر ہم ایسے ہی خیالوں کی پیروی کرنا چاہیں تو یقین کرنا چاہیئے کہ ترقی کی کوششوں سے پہلے ہی دستبردار ہو جانا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ قوم کی بھلائی چاہنے والے ان بے اصل باتوں اور غلط خیالات کو چھوڑ کر سچے اسلام اور سچے ایمان کی روشنی میں قائم رہیں گے اور توہمات کو اسلام یا ایمان کا یقین نہ سمجھیں گے۔"

مشابہت کا غلط نظریہ

بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمان یورپ والوں کا ایسا لباس پہن کر ان سے مشابہ ہو جائیں گے اور اس سے ان کا ایمان جاتا رہے گا۔ سرسید نے اس مہمل خیال کی تردید کی۔ اور حدیث تشبہ سے متعلق ایک خط کے جواب میں یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ محض ایک قول ہے اور اس کا حدیث ہونا ثابت نہیں ہے کسی قوم کا لباس پہن لینے سے ایمان نہیں چلا جاتا۔ احادیث میں یہ موجود ہے کہ رسولِ خدا صلعم نے یورپ کی قوم کا اور خاص رومن کیتھولکس میں جو مروج تھا وہ لباس پہنا ہے اور حضورؐ نے یہودیوں اور آتش پرستوں کا لباس بھی پہنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تمام مسلمان اور صحابہ اور خود جناب رسولِ خدا صلعم بھی وہی لباس پہنتے تھے جو کفارِ عرب پہنتے تھے۔ بہ اعتبار مذہب دو قومیں تھیں، مگر لباس میں کوئی تفرقہ کفار اور اہلِ اسلام میں تمیز کا قائم نہیں کیا گیا۔ پس کیا عقلِ سلیم اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ اگر جناب رسولِ خدا صلعم لندن میں یا جرمنی میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا لباس ویسا ہی نہ ہوتا جیسا کہ ان ملکوں کے لوگوں کا ہے۔"

داڑھی منڈانا درست ہے

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے طرزِ معاشرت کو بدلنے کے لیے ترکوں کو کیا [illegible]

بہت ہی اچھا نمونہ سمجھتے تھے۔ اور معاشری زندگی میں وہ کئی ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے جو ترکوں نے اختیار کر لی تھیں لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے قدامت پسند عناصر ان اصلاحات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور ترکوں کے لباس کی طرح وہ ان کے داڑھی منڈانے پر بھی شدید اعتراض کرتے تھے۔ سرسید داڑھی رکھنے یا منڈانے کو بجائے خود اہمیت نہ دیتے تھے۔ ان کے خیال میں اہم چیز یہ تھی کہ بال ترتیب اور سلیقے سے رکھے جائیں۔ چنانچہ ہندوستان میں جس بے ڈھنگے پن سے داڑھی رکھی جاتی تھی اس کے مقابلے میں وہ داڑھی منڈانے کے رواج کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس بارے میں ایک خط کا جواب دیتے ہوئے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ داڑھی رکھنے یا منڈانے کو تہذیب میں کچھ دخل نہیں ہے۔ بال جو انسان کے منہ پر اور سر پر خدا نے پیدا کئے ہیں اگر انسان ان کو پریشانی اور ابتری کی حالت میں رہنے دے جیسے کہ بعض میلے کچیلے جنگلی جانوروں کے ہوتے ہیں تو بلاشبہ یہ پورا وحشیانہ پن ہے۔ اور اگر ان کو درستی اور خوبی سے رکھے تو وہ تہذیب و شائستگی کی علامت ہے۔ اسی لئے تمام مہذب قومیں بقدر اپنی تہذیب اور موافق اپنے خیالات کے بال بناتی اور موافق اپنے مذاقِ تہذیب و خیالات کے ان کو آراستہ کرتی ہیں۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ جو امر خلافِ تہذیب مسلمانوں میں مروج ہیں ان کو دور کریں۔ پس داڑھی بشرطیکہ وحشیانہ پن سے نہ رکھی جائے تہذیب کے برخلاف نہیں ہے اور ہزاروں اور لاکھوں اشخاص جو مہذب قوم کے ہیں داڑھی رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی خوبصورت گورے رنگ کے چہروں پر بشرطیکہ گورا رنگ ہو کالی داڑھی نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں جب سفید ہو جائے تو منڈانے کے قابل ہو جاتی ہے بشرطیکہ منہ کی جھریاں اور گالوں کے گڑھے صورت کو بدنما نہ کر دیں۔ داڑھی منڈانی جائز ہو تو ہمارا کچھ حرج نہیں اور اگر نہ جائز ہو تو ہمارا کچھ حرج نہیں۔ لیکن داڑھی کو اگر ایک ٹٹی بنایا جائے،

جس کی اوجھل شکار کھیلا جائے تو اس سے تو منڈانا ہی بہتر ہے۔ اگر داڑھی منڈانی ناجائز ہے تو بیچارے ترکوں پر کیا الزام ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مقدس مولوی صاحب جبہ و عمامہ بھی داڑھی منڈاتے ہیں۔ آپ حضرات مقدسین کو دیکھتے ہوں گے کہ ہر جمعہ کی صبح کو اشراق کی نماز کے بعد نائی حاضر ہوتا اور اصلاح مبارک بناتا ہے۔ گالوں پر سے داڑھی مونڈی جاتی ہے۔ اور ایک قوسی خط میں قریب مدور کے کی جاتی ہے۔ ہونٹ اور ٹھوڑی کے بیچ میں ایک بچکانی بنائی جاتی ہے اور دونوں طرف سے مونڈی جاتی ہے۔ پھر حلقوم مبارک سے لے کر ٹھوڑی اور جبڑے کے قریب تک مونڈی جاتی ہے۔ بعض مقدسوں کو اپنے پھولے پھالے مچرب گالوں کے کھولنے کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ ریش مبارک صرف بطور ایک جھالر کے رہ جاتی ہے۔ پس کیا یہ داڑھی منڈانا نہیں ہے جو بیچارے ترکوں پر طعن کیا جاتا ہے۔ ترک تو داڑھی منڈا کر فرشتہ صورت ہو جاتے ہیں۔ اور یہ حضرت مقدسین بی چابن جاتے ہیں۔"[۱۱]

اسلامی ممالک میں نئی تہذیب

جو لوگ محض قدامت پرستی کو دین کی پابندی سمجھتے، طرز معاشرت میں اصلاح و ترقی کو گمراہی اور بے دینی تصور کرتے تھے ان کو سرسید نے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ زمانہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اور اس کی رفتار کا جو ساتھ نہ دیگا وہ پستی و زوال کی حالت میں پڑا رہے گا۔ ہر معاشرہ میں کچھ نہ کچھ خرابیاں ہوتی ہیں جن کو زمانے کے تقاضے درست کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوموں اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی ترقی سے سبق لینا اور اپنے طرز معاشرت میں اصلاح اور تبدیلی کرنا چاہیئے۔ اسلامی دنیا زندگی کے نئے طریقوں کو کس طرح اختیار کر رہی ہے اس کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ ترک انگریزی لباس پہنتے ہیں۔ اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں [illegible]

[illegible] کا خطبہ مکہ معظمہ کے منبروں اور مسجد نبوی کے منبر پر روضۂ مطہر کے سامنے پڑھا جاتا ہے، ٹرکش کوٹ و پتلون و بوٹ اور پھندنے دار لال ٹوپی پہنتے ہیں۔ اور اب یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جناب شریفِ مکّہ بھی انگریزی تہذیب کو پسند فرماتے جاتے ہیں۔ ان کا مکان بالکل یورپ کے اسباب سے سجا ہوا ہے۔ وہ انگریزی طور کا کھانا کھاتے ہیں اور فرانسیسی باورچی ان کے ہاں نوکر ہے۔ اُنھوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی ہے۔ سلطان زنجبار نے بھی فرانسیسی زبان پڑھنی اور سیکھنی شروع کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے بڑے بڑے سرداروں کو تمغے دئے ہیں جن میں سلطان زنجبار کی تصویر بنی ہوئی ہے اور وہ تو پڑے پکّے حنفی ہیں۔

تصویر کے متعلق حنفیوں کے ہاں یہ مسئلہ ہے کہ جاندار کی اس قدر تصویر جس سے زندہ رہنا ممکن نہ ہو بنانی یا رکھنی ناجائز نہیں ہے۔ اس لیئے وہ صرف چہرہ یا نصف قد کی تصویر بنانے کو جائز اور پورے قد کی تصویر کو ناجائز کہتے ہیں۔ اس مسئلہ کی رُو سے سرسید نے یہ استدلال کیا کہ پورے قد کی تصویر بھی جائز ہے۔ کیونکہ اس تصویر میں نہ انسان کا بھیجا بنا ہوتا ہے نہ پھیپھڑا، نہ معدہ، نہ خون، نہ روح۔ اور بغیر ان چیزوں کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ انسان و حیوان کی تصویریں بنانے والوں سے قیامت میں یہ کہا جائے گا کہ وہ ان تصویروں میں جان ڈالیں۔ تو درخت کی تصویر بنانے والوں سے بھی تصویر میں قوتِ نامیہ پیدا کرنے اور پھل پھول لگانے کو کیوں نہ کہا جائے گا۔ اگر درخت کی تصویر بنانا منع نہیں ہے تو پھر انسان کی تصویر بنانا کیوں منع ہے۔ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کے متعلق جو مسئلہ ہے اس میں کچھ غلطی ہے۔ اس طرح سرسید نے قدامت پرستوں کا یہ [illegible] کرنے کی کوشش کی کہ تصویر بنانا ناجائز ہے۔ اور نئی تہذیب کو [illegible] باتوں کو خلیفۃ المسلمین اور شریف مکّہ

جیسے مذہبی لوگ درست اور جائز سمجھتے اور اختیار کرتے [illegible]
کے مسلمان ناجائز کیوں کہتے ہیں۔[illegible]

ترکوں کی قابلِ تقلید مثال

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشری زندگی میں اصلاح کرنے اور کن چیزوں میں اصلاح کرنے کی ضرورت ہے اس کو ذہن نشین کرانے کے لیے سرسید نے اس زمانے کے ترقی پسند ترکوں کو نمونے کے طور پر پیش نظر رکھا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کو معاشرہ کے لیے ضروری اصلاحات کی نوعیت سے آگاہ کرنے کے لیے انھوں نے سلاطین اور دوسرے ممتاز مصلحین کے کارنامے بیان کیے جنھوں نے مسلمانوں کے طرزِ معاشرت اور طریقۂ تمدّن میں ترقی کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔ اور جن کی جدوجہد سے ترکوں کی معاشری حالت بہتر ہو گئی۔ سرسید کے نزدیک سلطان محمود خاں بہت بڑے مصلحِ معاشرت تھے جن کی اصلاحات سے مسلمانوں کی تہذیب و تمدّن اور اخلاق و معاشرت میں نئے دَور کا آغاز ہوا۔ کیونکہ انھوں نے مذہبی تعصّب کو ختم کر دیا اور مختلف مذاہب کی رعایا کو مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی دی۔ رفاہِ عام کے کاموں پر خاص توجہ کی۔ نئے علوم کی اشاعت کے لیے اسکول قائم کیے۔ اور ان کی تشریح کے لیے باتصویر کتابیں شائع کروائیں۔ جدید طرز کے شفاخانے بنائے غلامی کے رواج کو ختم کیا اور غلاموں کو آزاد کر دیا۔ ترکوں کے لباس میں اصلاح کی اور کوٹ، پتلون اور سُرخ ٹوپی کو قومی لباس کے طور پر اختیار کر لیا۔ کھانا کھانے کا طریقہ بدلا اور میز و کرسی پر بیٹھ کر چمچے اور چھری کانٹے سے کھانے کا طریقہ رائج کیا۔ اور صاف ستھری و شائستہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔ سلطان محمود کے جانشین سلطان عبدالمجید [illegible] کیں اور لغو مذہبی تعصبات اور غلط [illegible] درست کیے۔ نظامِ سلطنت کو [illegible]

[illegible] یونیورسٹی قائم کرکے جدید و اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں [illegible] یورپی زبانوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا تاکہ ترک مغربی علوم سے بخوبی واقف ہو سکیں۔[۱] جدید تہذیب کی یہ وہ خوبیاں ہیں جو ترکوں نے اپنے معاشرہ کی اصلاح کرنے کے لیے اختیار کی تھیں اور ان کی ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ضرورت تھی اور اسی لیے سرسید کی یہ کوشش تھی کہ ہندوستانی مسلمان بھی ترکوں کے نقشِ قدم پر چلیں اور اپنے طرزِ معاشرت میں اصلاح کرکے جدید تہذیب و شائستگی اختیار کریں۔

حوالے

۱۔ ماخوذ از رسالہ ابطالِ غلامی۔ مصنفہ سید احمد خاں

۲۔ ماخوذ از خطبات احمدیہ سید احمد خاں۔ خطبۂ چہارم۔ مطبوعہ ۱۹۰۳ء

۳۔ تہذیب الاخلاق۔ جلد ہفتم۔ شمارۂ جمادی الاوّل ۱۲۹۴ھ

۴۔ ماخوذ از مقالاتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ جلد پنجم صفحہ ۹۷ تا ۱۳۷

۵۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ۔ مارچ ۱۸۷۶ء

۶۔ " " " " اکتوبر ۱۸۷۶ء

۷۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد سوم۔ شمارہ محرم ۱۲۸۹ھ

۸۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین صفحہ ۷۲

۹۔ سفرنامۂ پنجاب (سید احمد خاں) مرتبہ سید اقبال علی۔ جواب ایڈریس جالندھر فروری ۱۸۸۴ء

۱۰۔ مکتوباتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ صفحہ ۲۰۲

" " " " صفحہ ۲۱۵

[illegible] تہذیب الاخلاق۔ جلد ششم۔ شمارہ ۱۲۹۲ھ

[illegible] کے مضامین تہذیب الاخلاق۔ صفحہ ۴۳۸

آٹھواں باب

ملّی اتحاد اور مذہبی رواداری

ہندوستان میں تفریق وانتشار اور مذہبی اختلافات نے پورے معاشرہ پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا اور قومی اتحاد و ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کردی تھیں۔ حکومت اور سیاسی اقتدار سے مسلمانوں کی محرومی کی وجہ سے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا اور ان کا رعب داب ختم ہو رہا تھا۔ اقتصادی کمزوری نے ان کا معاشری وقار گرا دیا تھا۔ اسلام کے بنیادی اصول و مقاصد کے بجائے وہ فروعات کو اہمیت دینے لگے تھے اور عقائد میں فرق نے دینی اتحاد اور ملّی قوت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لیے وہ ان کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے اور ان سے خوف زدہ رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور ان کا تعاون حاصل کرلیا۔ مسلمان چونکہ انگریزوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے تھے اس لیے ان کے خلاف بہت شدید جذبہ رکھتے تھے۔ اور اس طرح مسلمانوں اور انگریزوں میں اختلاف بڑھتا جارہا تھا۔ ہندو جو صدیوں مسلمانوں کے محکوم رہ چکے تھے انگریزوں کی سرپرستی سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کے قومی وقار، معاشری برتری اور تہذیب و ثقافت کو مٹا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ان کے طرزِ عمل نے [illegible] شدید اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔ اس طرح پورے ملک [illegible]

[illegible] اور ہندوستانی معاشرہ کی حالت روز بروز خراب تر [illegible] جا رہی تھی۔

مسلمانوں میں اتحاد

سرسید نے ان تمام خرابیوں کو شدت سے محسوس کیا اور معاشرہ کی فلاح و بہبود، قوم کی ترقی و استحکام اور تمام فرقوں اور قوموں میں تعاون و ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ملی و قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور حاکم و محکوم قوموں میں مفاہمت اور ارتباط کو ضروری تصور کیا۔ چنانچہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے یہ کوشش کی کہ مسلمانوں کے تمام فرقے باہمی اختلافات کو نظر انداز کر کے اخوتِ اسلامی کے رشتہ کو مضبوط بنائیں۔ ملک اور قوم کی بہتری و مفاد کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد بڑھایا جائے۔ اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان جو سیاسی اور مذہبی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور کر کے ان میں اچھے تعلقات قائم کیے جائیں۔

روحانی رشتہ مختلف قوموں اور فرقوں میں اتحاد و رواداری اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی اس جدوجہد میں سرسیّد نے مسلمانوں میں اتحاد اور دینی اخوت کے فروغ کو اوّلین اہمیت دی۔ اسلام نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دے کر جو روحانی رشتہ قائم کر دیا ہے اس کی ضرورت و اہمیت کو ذہن نشین کرنے، نفاق سے محفوظ رہنے اور عقاید میں فرق کو نظر انداز کر کے اسلام کے اہم مقاصد کی تکمیل کے لیے متحد و متفق ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے سرسیّد نے یہ واضح کیا کہ زمانۂ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانے سے بھی بالاتر ہے قوموں کا شمار کسی بزرگ کی [illegible] ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد الرسول اللہ [illegible] صلعم نے اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا

مٹا دیا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک [illegible]
محمدؐ رسول اللہ سے مضبوط ہے۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی [illegible]
اس روحانی رشتہ کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی
رشتہ قائم ہو گیا۔ اسلام کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک۔ وہ
افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا۔ وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا۔ وہ
پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان (یو۔پی) میں۔ وہ کالے رنگ کا ہے
یا گورے رنگ کا۔ بلکہ جس نے اس عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک
قوم ہو گیا۔ بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا بن گیا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے
انما المؤمنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم
ترحمون۔ جب کہ خود خدا نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی
فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک لافانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک ہے۔[1]

فرقہ بندی کے نتائج مسلمانوں میں فرقہ داری اختلاف کی شدید مذمت
کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ "مجھے آج یہ دیکھ کر
افسوس ہوتا ہے کہ ہم سب مسلمان آپس میں بھائی تو ہیں مگر برادرانِ یوسف
کے مثل ہیں۔ آپس میں دوستی و محبت۔ یک دلی و یک جہتی بہت ہی کم
ہے۔ حسد و بغض و عداوت کا بُرا اثر ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ آپس کی
نا اتفاقی ہے۔ شیطان ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے ان
بھائیوں کے درمیان جن کو خدا نے بھائی بنایا ہے نفاق ڈالنے میں کامیاب
ہوتا ہے۔ اور جس طرح کہ ہمارے باپ آدم اس کے دھوکے کو خالص دوستی
سمجھ کر دھوکے میں آ گئے اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آ جاتے ہیں
اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے ایک مقدس لباس پہنا دیتے
ہیں۔ یعنی ہم اس کو مذہبی مقدس لباس کا [illegible]
شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا کہ [illegible]

[illegible] قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے اور [illegible] خدا نے قایم کیا تھا چھوڑا ہے جس قصبہ و شہر میں جاؤ۔ جس مسجد و امام باڑہ میں گذرو مسلمانوں میں شیعہ و سنی، وہابی و بدعتی، لامذہب و مقلد ہونے کی بناء پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے۔ ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے انجام میں اس نااتفاقی نے بہت کچھ بد اثر پہنچایا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ دولت میں کم ہیں۔ تجارت میں کم ہیں۔ اور اس باہمی نفاق و عداوت سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کم سے کم ہو گئے ہیں۔"[۲]

اتحاد و اتفاق بڑھانے کے اصول

عقائد میں اختلاف ہونے کے باوجود مسلمانوں کے تمام فرقوں میں اتحاد و اتفاق کو بڑھانے کے لئے سرسید نے اس بات پر زور دیا کہ "ہماری قوم کی ترقی کا سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے بدل دیں۔ یکتائی و یک جہتی سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر ہو جائیں۔ یہ امر تو قانونِ قدرت کے برخلاف ہے جو نہیں ہو سکتا۔ نہ پہلے کبھی ہوا اور نہ آیندہ کبھی ہوگا۔ مگر اس اتفاق کو قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر لفظوں میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی [illegible] اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہے اس کا معاملہ [illegible] ہے نہ بھائی اس میں شریک ہے نہ بیٹا۔ نہ دوست۔

نہ آشنا۔ نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک شخص کی ذات [illegible]
ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے، کچھ تعلق نہ رکھنا چاہیئے۔ ہم کو کسی شخص سے
اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی، وہابی ہے یا بدعتی، لا مذہب ہے یا مقلد
ہے یا نیچری، جب کہ وہ خدا اور خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی
عداوت و مخالفت نہیں رکھنی چاہیئے۔ بلکہ اس کو بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا اور
اس اخوّت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے قائم رکھنا چاہیئے۔ نہایت افسوس
اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود
اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ ضرر اور نقصان نہیں۔ جو حصّہ کہ انسان
میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اسی سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے۔ اور وہ حصّہ
آپس کی محبت۔ باہمی دوستی۔ ایک دوسرے کی اعانت۔ ایک دوسرے کی
ہمدردی ہے جس کے مجموعہ کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے
خدا کے حکم کی بھی اطاعت ہو اور آپس میں برادرانہ برتاؤ۔ قومی اتفاق۔ قومی
ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔"

غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات

قومی ترقی اور معاشری اصلاح کے لیے سرسید کی پہلی کوشش تو یہ تھی
کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے اسلامی اخوّت کے
رشتہ کو مضبوط بنائیں۔ اور دوسری کوشش انھوں نے یہ کی کہ ہندوستان
میں رہنے والی مختلف قوموں میں اتحاد و ہم آہنگی اور مذہبی رواداری کو
تقویت دی جائے۔ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے تعلقات خوش گوار ہو جائیں
ہندو اور مسلمان مل جل کر رہیں اور اس بات کا خیال رکھیں کہ [illegible]
اور بہتری کے لیے ان دونوں قوموں کا اتحاد [illegible]
مسلمانوں اور انگریزوں میں میل جول [illegible]

[illegible] اسلام اہلِ کتاب سے اچھے تعلقات رکھنے کا حامی ہے۔ [illegible] باتوں کو اپنے دل سے نکال دیں جن کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے [illegible] ہیں۔

حُبِ ایمانی اور حُبِ انسانی

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسیّد نے مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ انسانوں میں جو محبت اور دوستی ہوتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو حبِ دینی ہے جو ایک مذہب رکھنے والے لوگوں میں دینی اشتراک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری حبِ انسانی ہے جو مختلف انسانوں میں معاشری تعلقات اور مشترک تہذیب و تمدّن کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے بزرگانِ دین سے جو کئی سو برس پہلے گذر چکے ہیں محبت و عقیدت ہوتی ہے۔ دوسرے ملک کے مسلمانوں سے ان کو گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ ان کے لیے برادرانہ جذبات رکھتے ہیں۔ اپنے ملک کے مسلمانوں کو وہ بہت عزیز رکھتے اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ یہ محبت دینی رشتہ کی پیدا کردہ ہوتی ہے جو صرف مسلمانوں سے ہو سکتی ہے۔ اور اس قسم کی محبت غیر مسلموں سے رکھنا شرعاً ممنوع، حرام، بلکہ کفر ہے۔ لیکن محبت کی ایک اور قسم ہے جو انسانی تعلقات کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم اگر ایک ساتھ رہیں۔ آپس میں ملنا جلنا، کھانا پینا، ہنسی دل لگی، بات چیت اور مزاج میں باہمی موافقت ہو۔ اور ایک دوسرے کے ہمدرد، خیر خواہ اور مددگار رہیں تو ان میں قدرتی طور پر محبت اور دوستی پیدا ہو جائے گی۔ اور غیر مسلموں سے اس قسم کی دوستی کرنا مسلمانوں کے لیے [illegible] ہے۔ مذہب اسلام کی رُو سے کافروں سے صرف وہی دوستی [illegible] حیث الدین ہو۔ اور اس کے سوا کسی کی دوستی اور محبت [illegible] دوسرے انسان سے ہو سکتی ہے کافروں سے کرنی شرعاً ممنوع [illegible] کا خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور

دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ ان کی محض غلطی ہے [illegible]
انسان کی فطرت میں بنائی ہے وہ برحق اور بالکل حق ہے [illegible]
سے گو وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور [illegible]
لیکن یہ تمام محبت اور دوستی حُبِ انسانی کے درجہ پر ہو۔ کیونکہ حُبِ ایمانی بلا
اتحادِ مذہب ہونی غیر ممکن ہے۔ اور یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب
اسلام نے کی ہے۔[۴]

مختلف مذاہب کے لوگوں میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت بیان کرتے
ہوئے سرسید نے انجمن پنجاب کے سپاس نامہ کے جواب میں کہا تھا کہ "میری
آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے
کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علاحدہ علاحدہ ہے۔ مگر اس کے
لحاظ سے آپس میں دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف
قسم کے کھانے موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی
کسی کو۔ مگر اس اختلافِ طبائع کی وجہ سے اس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو
باہم کچھ رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے
مختلف مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج کی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر شخص
اپنے ایمان کا مختار ہے۔ وہ اچھا ہے تو اس کے لیے اور برا ہے تو اس کے لیے۔
آپس کی محبت میں جو انسان کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے اس سے
کچھ نقصان نہیں آسکتا۔"[۵]

مختلف مذاہب کے لوگوں میں اتحاد اور مذاہب کے پیشواؤں کا احترام

کشیدگی پیدا کرنے کا ایک [illegible]
بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ بعض اوقات دوسرے مذاہب کے
احترام کرنے کے بجائے اُن کی توہین کر [illegible]
ہے اور اسلام نے تو اس کی سختی سے [illegible]

[illegible] کو دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کا ادب کرنا چاہیے۔ [illegible] بات پر اظہار افسوس کیا کہ جب مذہبی مباحثوں کی کوئی [illegible] ہے تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح پر ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں، جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں ان کا ذکر کریں تو ہم کو لازم ہے کہ ان کو برا نہ کہیں۔ بلکہ ادب اور تعظیم سے ان کا ذکر کریں۔ خواہ وہ لوگ ہندو ہوں یا پارسی، عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں۔ اگر ہم ان کے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش آئیں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ "مت برا کہو ان کو جو خدا کے سوا اور کسی کی عبادت کرتے ہیں۔ پھر وہ بڑھ کر نادانستگی سے خدا کو برا کہیں گے۔" (انعام۔۱۰۸) پس حقیقت میں غیر مذاہب والوں کے پیشواؤں کو برا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو برا کہلانا ہے۔ علاوہ اس کے یہ اخلاق اور متانت سے بہت بعید ہے کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا کا بے ادبی سے ذکر کریں۔[۶]

ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت

سرسید کی تمام جدوجہد مسلم معاشرہ کی اصلاح اور بالخصوص مسلمانوں کی [illegible] ترقی پر مرتکز تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت پست تھی اور [illegible] معاشرہ میں بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن معاشری [illegible] کے لیے سرسید جو کوشش کر رہے تھے اس میں وہ ہندوؤں کی بھلائی [illegible] کو بھی ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ پورے ملک کی [illegible] اس کے لیے اس ملک میں رہنے والی تمام قوموں کی

حالت کو بہتر بنانا ضروری تھا۔ سرسید نے [illegible]
میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر ایک قوم نے ترقی کی اور دوسری
نہ کی تو ہندوستان کا حال کچھ اچھا نہیں ہونے کا۔ بلکہ اس کی مثال ایک
کانڑے آدمی کی سی ہوگی۔ لیکن اگر دونوں قومیں برابر ترقی کرتی جائیں تو
ہندوستان کے نام کو بھی عزت ہوگی اور بجائے اس کے کہ وہ ایک کانڑی،
بال بکھری، دانت ٹوٹی بیوہ کہلاوے ایک نہایت خوبصورت پیاری
دُلہن بن جائے گی۔

ہندوستان کی دو آنکھیں

یہی سبب تھا کہ تمام ایسے موقعوں پر جب ہندو
اور مسلمان جمع ہوتے تھے سرسید دونوں
قوموں کو اتفاق اور ایک دوسرے کی خیرخواہی و خیراندیشی کی نصیحت کرتے تھے
ہندوؤں اور مسلمانوں میں ارتباط کی ضرورت واضح کرتے ہوئے سرسید نے
کہا کہ "جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندوؤں اور مسلمانوں
میں ترقی پکڑتا جائے ہم کو نہایت خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ صدیاں گذر گئیں کہ
ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی پیداوار کھاتے ہیں۔
ایک ہی ملک کے دریاؤں کا پانی پیتے ہیں۔ ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے
ہیں۔ پس ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ منافرت نہیں ہے۔ ہم نے متعدد دفعہ
کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دُلہن ہے اور ہندو اور مسلمان
اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں
سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوب صورت
دُلہن بھینگی ہو جائے گی۔ اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔
پس ہماری رائے میں اختلاف مذہب جیسا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں
ہے سوشل برتاؤ اور باہمی محبت اور اخلاص اور ایک [illegible]
ہمدردی کا مانع نہیں ہو سکتا۔"

[illegible] دونوں کا وطن ہے۔ مرنے جینے میں دونوں
[illegible] ساتھ رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا۔ دونوں
[illegible] ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے
مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں اختیار کر لیں۔
ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں لے لیں۔ ہم دونوں آپس میں
یہاں تک ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اُردو پیدا کر لی جو نہ تو
ہماری زبان تھی اور نہ ان کی۔ پس یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی
لفظ ہے۔ ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس
اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں کہ قوم کا لفظ ملک کے باشندوں کے لیے
بھی بولا جاتا ہے۔ اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزّل
کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیا ہو گیا ہے۔"[۹]

سرسیّد مسلمانوں کو ایک دوسرے کا روحانی بھائی کہتے تھے۔ اور
ہندوؤں کو اپنا وطنی بھائی سمجھتے تھے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کے
لیے اُنھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ روحانی بھائیوں کے سوا ہمارے وطنی
بھائی بھی ہیں۔ گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں جس نے ہم مختلف فرقوں کو
ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنا دیا ہے شریک نہیں ہیں۔ مگر
بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں۔
ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت
پاتے پاتے ہم ملکی و ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے۔ ان وطنی بھائیوں
کا [illegible] بھی دو حصے ہیں۔ ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا۔ ان کا
[illegible] کا حصہ ہے اور وہ خدا کے لیے چھوڑ دو۔ اور تمام امورِ انسانیت
[illegible] اخوت سے جو ابنائے جنس کا حصہ ہے اس سے غرض رکھو۔
[illegible] رکھتے ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے

مددگار رہو۔ آپس میں سچی محبت، سچی دوستی [illegible]
دونوں قوموں کے ترقی کرنے کا یہی راستہ ہے [illegible]

علی گڑھ کالج

سرسید نے رفاہِ عام کے جتنے کام کیے ان میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو شریک رکھا۔ ہندوؤں کیلئے بھی ہے ان کی اصلاحی کوششوں میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور جیسا کہ سرسید نے واضح کر دیا تھا اس کا قیام کسی فرقہ واری رجحان کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ سرسید نے یہ ادارہ اس لیے قایم کیا تھا کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے تھے۔ انگریزی تعلیم سے متنفر تھے اور سرکاری مدرسوں میں دینی تعلیم و تربیت کا ویسا انتظام نہ ہو سکتا تھا جو وہ مسلمانوں کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ اس مدرسہ میں ہندو بھی پڑھتے تھے۔ اور سرسید کی یہ خواہش تھی کہ وہ اس ادارہ سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ انجمنِ اسلامیہ امرتسر کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے سرسید نے یہ واضح کر دیا تھا کہ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوس ناک محرومی ان کو یورپین سائنس اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کے رفع کرنے کو قایم کیا گیا۔ مگر اس میں ہندو اور مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس [illegible] کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ممالک میں ہندوستانی [illegible] جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں [illegible] کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے [illegible] مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ [illegible]
یہ دونوں بھائی ایک [illegible] ورثہ [illegible]
ایک ہی طرح کے وسائل [illegible]

[illegible] العلوم کے قائم کرنے میں بھی یہی مطلب تھا۔[11]
[illegible] اپنی لاہور کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے بھی
[illegible] کے متعلق اپنی پالیسی اور مقاصد کو واضح کرتے ہوئے
[illegible] افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ کہے گا کہ محمڈن اینگلو اورینٹل
کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے
قائم کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے قائم کرنے کا ہوا یہ تھا کہ مسلمان
روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے جاتے تھے۔ ان کے مذہبی تعصبات
نے ان کو اس تعلیم سے فائدہ اُٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور
مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی۔ اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ
ان کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جائے۔ یہی خیال تھا جس نے مجھ کو یہ
کالج قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ مگر میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں
کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام
حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید
کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں
اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے صرف وہی شخص انعام کا
دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں
ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت
[illegible] بورڈ کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔[12]"

[illegible] قومی اتحاد کا [illegible]

سرسید اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ لسانی اتحاد قومی اتحاد کا بہت اہم اور مؤثر ذریعہ ہے۔ کسی ایک ملک میں رہنے والی مختلف [illegible] اگر ایک ہو تو ان میں اتحاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اتحاد ملک [illegible] بناتا ہے۔ سرسید یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان

میں کئی قومیں آباد ہیں۔ جن کا مذہب مختلف ہے اور ان کی [illegible]
میں بھی فرق ہے۔ ایسی قوموں کو ایک دوسرے سے قریب [illegible]
کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ جو ہندوستان میں موجود ہے اردو زبان ہے۔
شمالی ہند میں اس زبان کی ہمہ گیری سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انگلستان
جاتے ہوئے الہ آباد سے بمبئی تک سفر میں انھوں نے یہ دیکھا کہ تمام علاقوں
میں اردو کا عام رواج ہے۔ حکومت کے کارکنوں سے لے کر چپراسیوں اور
قلیوں تک سب اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ جہاز کے لوگوں کو اور پھر عدن
کے بازاروں میں عربوں اور سمالیوں کو یہ زبان بولتے سنا۔ اس سے ان کو
یہ خوشی ہوئی کہ ہندوستان میں ایک ایسی مشترکہ زبان موجود ہے جو سارے
ملک کی عام زبان ہے۔ اور یہ قومی اتحاد کو ترقی دینے میں بہت مفید و معاون
ہوگی۔ انگلستان میں قیام سے ان کو یہ اندازہ ہوا کہ اس ملک کے اتحاد و
استحکام میں مشترکہ قومی زبان کا بڑا حصہ ہے۔ اور اس کی ترقی کا ایک بڑا
سبب یہ بھی ہے کہ انگریز قوم نے تمام علوم و فنون اپنی زبان میں حاصل کیے
ہیں۔ اس تجربہ نے سرسید کی نظر میں اردو زبان کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔
اور وہ اس کو قومی اتحاد و استحکام اور ہر جہتی ترقی کا ذریعہ سمجھنے لگے۔

فرقہ پرستوں کا مایوس کن طرزِ عمل

سرسید تو اردو زبان کو قومی اتحاد کا ذریعہ بنا کر ملک و قوم کو ترقی دینے
کی فکر میں تھے۔ اور دوسری طرف بنارس کے فرقہ پرست ہندوؤں نے اردو
ہندی کا قضیہ کھڑا کر دیا۔ انگریزوں کی سرپرستی نے تعلیم یافتہ ہندوؤں
کے حوصلے بڑھا دیے تھے اور ان میں کچھ لوگ فرقہ پرست [illegible]
تھے جو یہ چاہتے تھے کہ جس قوم نے اس ملک پر صدیوں [illegible]
اس کی یادگاروں کو مٹا دیا جائے۔ بنارس [illegible]
کو موقوف کر کے مقامی [illegible]

[illegible] مقصد کو آگے بڑھانے کے لئے
[illegible] کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اردو کے خلاف اس
[illegible] الہ آباد میں ایک مرکزی مجلس قائم کر دی گئی۔ جب یہ
[illegible] علاقوں میں بھی پھیلنے لگی تو سرسید کو بڑی مایوسی ہوئی۔
وہ مشترکہ زبان کی اساس پر قومی اتحاد کو تقویت دینے کے جو منصوبے بنا رہے
تھے وہ سب خاک میں مل گئے اور ہندو فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں سے ان کو
یہ یقین ہو گیا کہ "اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ ساتھ
چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کی ترقی کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال
ہے" یہ اختلاف جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں نے پیدا کیا تھا اور سرسید کو یہ
یقین تھا کہ ان لوگوں کی وجہ سے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد
بڑھے گا۔[۱۱] سرسید کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔

مسلم مسیحی اتحاد

سرسید اصلاح معاشرہ کے لیے جو کوششیں کر رہے تھے ان میں بہت
اہم اور ضروری لیکن نہایت مشکل مسلمانوں اور انگریزوں کے تعلقات کو
بہتر بنانے کا مسئلہ تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے ہندوستان کی سلطنت
چھینی تھی اور ان دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض و عداوت ہونا
لازمی تھا۔ بے اعتمادی نے انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے شکوک
[illegible] پیدا کیے اور مسلمان اس قوم کی ہر چیز سے نفرت کرنے لگے جو ان کی
[illegible] کا باعث بنی تھی۔ اس طرح دونوں میں ایک دوسرے
[illegible] غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اور اس ناگوار صورت
[illegible] بڑا سرسید اس حقیقت کو محسوس کرتے تھے کہ
[illegible] درمیان اچھے تعلقات نہ ہونے سے مسلمانوں کو

کس قدر نقصان پہنچا ہے اور [illegible]
محسوس نہ کیا اور اپنی اولاد کو [illegible]
نہ بنایا تو ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل [illegible]

انگریزوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ

ایسے نازک حالات [illegible]
پہلی کوشش یہ کی کہ انگریزوں کے
دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو شکوک و شبہات ہیں وہ دور ہو جائیں اور
۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بعد وہ مسلمانوں سے جو خطرہ محسوس کرنے لگے
ہیں اس کو غلط ثابت کیا جائے۔ انگریزوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمان اپنے
مذہب کے احکام کے بموجب عیسائیوں کے دشمن ہیں اور ان کو نجس سمجھتے
ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مذہب کی رُو سے انگریزوں کے خلاف
جہاد کرنا واجب ہے اور یہی سبب ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں مسلمانوں
نے سب سے زیادہ حصّہ لیا اور ان کی حکومت کو ختم کر دینے کے لیے بغاوت
کی۔ سرسید نے ان خیالات کو دور کرنے کے لیے اپنی تحریروں سے یہ ثابت
کیا کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے عداوت نہیں ہے۔ ان میں آغازِ اسلام
ہی سے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ مسلمان عیسائیوں کی تحقیر نہیں کرتے
بلکہ ان کو اہلِ کتاب سمجھتے اور ان کے پیغمبر کا احترام کرتے ہیں۔ جہاد کے
بارے میں سرسید نے یہ واضح کیا کہ جہاد کا مطلب وہ نہیں [illegible]
نے سمجھ لیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کی وجہ جہاد کا [illegible]
دوسرے اسباب تھے۔ اور انگریزوں کی [illegible]
غدر کے بعد مسلمانوں کی [illegible]
آئیں جن میں ان کو لفظ نصاریٰ سے [illegible]
کہ جس طرح یہودی [illegible]
رہنے والا کہتے [illegible]

[illegible] ان مسلمانوں کو سخت سزائیں دیں جنھوں
[illegible] سرسید نے یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے ایک رسالہ
[illegible] میں یہ ثابت کیا کہ لفظ نصاریٰ ناصرہ سے مشتق
[illegible] سے مشتق ہے۔ یہ خود حضرت عیسیٰ اور حواریوں کے قول کے
[illegible] ہے اور آنحضرتؐ کے زمانے میں عیسائی خود اپنے تئیں نصاریٰ کہتے تھے[۱۴]

اس رسالہ کے علاوہ سرسید نے "تبیین الکلام" کے
انجیل کی تفسیر نام سے انجیل کی تفسیر لکھی جس کا ایک مقصد یہ بھی
تھا کہ مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے اصولوں میں جو مطابقت ہے وہ ثابت کی
جائے اور جہاں اختلاف ہے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے تاکہ
اسلام کی نسبت عیسائیوں کو جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو سکیں۔ انھوں نے
یہ بات بڑی وضاحت سے لکھی کہ مسلمان بھی اہلِ کتاب کی طرح انبیاء کا
مبعوث ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور تمام اگلے پیغمبروں اور ان کی کتابوں
پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں آنحضرتؐ کے زمانے میں موجود تھیں اور ان کتابوں
کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار عیسائیوں نے قائم کیا ہے وہی مسلمان
بھی قائم کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو اختلاف دینی اعتبار سے
[illegible] ہے وہ تعصب اور لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اور جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی
[illegible] دور کر کے یہ اختلاف ختم کیا جا سکتا ہے[۱۵]

[illegible] اسباب ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بارے میں انگریزوں کی
[illegible] جو رائے تھی اور وہ مسلمانوں پر اس کی جو ذمہ داری
[illegible] مسلمانوں کو شدید ترین مصائب و مشکلات کا
[illegible] وہ انگریزوں کی آتشِ انتقام سے محفوظ نہ
[illegible] نے ایک رسالہ اسبابِ بغاوتِ
[illegible] اور اس کی تقریباً تمام جلدیں

پارلیمنٹ کے ممبروں کے پاس انگلستان [illegible]
نے یہ واضح کیا کہ یہ شورش نہ تو کسی بیرونی قوم کی [illegible]
ہندوستانی قوموں نے انگریزوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے سازش کی
تھی۔ باغیوں نے جہاد کا جو فتویٰ شائع کیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ مسلمانوں نے
نہ تو جہاد کرنے کا فیصلہ کیا اور نہ وہ ایسا کر سکتے تھے کیونکہ وہ انگریزوں کی
عملداری میں امن سے رہتے تھے۔ فوج نے بھی پہلے سے نہ تو بغاوت کے لیے
منصوبہ بنایا تھا اور نہ بادشاہِ دہلی سے اس کی سازش تھی۔ اس شورش
کا اصل سبب یہ تھا کہ حکومت سے کچھ سیاسی غلطیاں ہوئیں اور اس نے
بعض ایسے کام نہیں کئے جن کا کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ پادریوں
کے طرزِ عمل اور طریقۂ تعلیم میں تبدیلی سے رعایا میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی
کہ ان کے مذہب میں مداخلت کرتے اور ان کو عیسائی بنانے کی کوشش
کی جا رہی ہے۔ رعایا کے حالات سے حکومت کی ناواقفیت، نیلامِ زمینداری۔
بندوبست کی سختی اور اسٹامپ کی اجرائی۔ اور رعایا کی مفلسی۔ حکام کی
بدسلوکی اور بدانتظامی جیسے اسباب نے بے چینی پیدا کر دی۔ اور اس کا نتیجہ
شورش و سرکشی کی شکل میں نکلا۔ اس طرح سرسید نے یہ واضح کر دیا کہ یہ شورش
مسلمانوں کے دل میں عیسائیوں سے نفرت یا جذبۂ جہاد کا نتیجہ نہ تھی بلکہ
بعض سیاسی غلطیاں اور خرابیاں اس کی ذمہ دار تھیں۔ اسبابِ بغاوتِ
ہند کے علاوہ سرسید نے لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے رسالہ کا ایک
سلسلہ بھی شروع کیا جس میں ان مسلمانوں کے حالات [illegible]
کئے جاتے تھے جنھوں نے حکومت کی خیر خواہی [illegible]
سے بچایا تھا اور فتنہ و فساد کے زمانہ میں [illegible]
سرسید کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں [illegible]
کے تمام مسلمان انگریزوں کے [illegible]

[illegible] کو مناسب اور ضروری خیال کرتے تھے[۱۷]

مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول

[illegible] کی شورش عظیم کے بعد جو حالات پیش آئے اور انگریزی حکومت نے مسلمانوں کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی اس کے پیشِ نظر سرسید نے مسلمانوں کی بہتری اور آیندہ ترقی کے لیے دو باتوں کو ضروری خیال کیا۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا ہو اور دوسرے یہ کہ مسلمان جدید تعلیم حاصل کر کے اپنی معاشری اور اقتصادی حالت کو بہتر بنائیں۔ سرسید کو یہ یقین تھا کہ جب تک مسلمان ان دو باتوں پر توجہ نہ کریں گے وہ ہندوستان میں عزّت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ چونکہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ مسلمان حکمران قوم سے نفرت کرنے اور ان سے بالکل الگ رہنے کی پالیسی ترک کر دیں۔ اور انگریزوں سے میل جول پیدا کریں۔ ان کے اخلاق و کردار اور معاشرت میں جو اچھائیاں ہیں وہ اختیار کریں۔ اور اپنی تعلیم، معاشرت اور تہذیب کی اصلاح و ترقی پر پوری طرح توجہ کر کے ایسا معاشری وقار حاصل کریں کہ انگریز بھی ان کو مہذب اور تعلیم یافتہ قوم سمجھیں اور ان سے اچھا برتاؤ کریں۔

اس مقصد کو بخوبی حاصل کرنے کے لیے سرسید کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں معاشری اصلاح کے خواہش مند لوگ اہلِ یورپ کی تہذیب و تمدن اور تعلیم و معاشرت کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور ان میں جو [illegible] وہ اپنے ملک کی ترقی کے لیے اختیار کر لیں چنانچہ سرسید [illegible] یورپ کا سفر کیا۔ اور انھوں نے اس سفر کی [illegible] میں یہ واضح کر دیا کہ۔ یہ بات بخوبی میرے

ذہن نشین ہے کہ ہندوستان کی فلاح اور [illegible]
لیے اس کے سوا اور کسی امر کی ضرورت نہیں ہے کہ [illegible]
کے درمیان ربط و ضبط کو ترقی دی جائے۔ تاکہ اہل ہندوستان [illegible]
ملکوں کی شائستگی کے عجیب و غریب نتیجوں اور اس کی ترقی کے [illegible]
مشاہدہ کریں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ
کیسے دولت مند، طاقت ور اور دانا ہیں۔ اور ان مفید اور عمدہ باتوں
کو ہندوستان کی بھلائی کے واسطے سیکھیں اور جانیں کہ اس باب میں
انگلستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں۔ اور کارخانوں اور کاشتکاری
اور شفا خانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اس کی دولت
اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔"[۱۸]

انگریزوں سے میل جول بڑھانے اور ان کی معاشری خوبیوں کو
اپنانے کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید مغربی تعلیم سے روشناس کرانا
بھی سرسید کا ایک اہم مقصد تھا۔ اور اس کے لیے بھی یہ ضروری اور مفید تھا
کہ وہ یورپ جا کر وہاں کے طرزِ تعلیم اور مقاصدِ تعلیم سے بخوبی واقفیت حاصل
کریں۔ اور اپنے تعلیمی اداروں کو اس کے مطابق بنائیں۔ چنانچہ سرسید نے
انگلستان کے تعلیمی اداروں کو تفصیل سے دیکھا اور اس سے [illegible]
ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے کالج یا یونیورسٹی قائم کرنے کا [illegible]

خوشگوار تعلقات

مسلمانوں اور [illegible]
لیے سرسید نے [illegible]
پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں اور [illegible]
ہے مگر اگلے زمانے میں باہمی [illegible]
قرآن مجید میں بھی [illegible]
[illegible]

[illegible] عالم اور درویش ہیں۔ وہ تکبر نہیں کرتے۔"
[illegible] نے بھی اپنی کتاب میں یہ اعتراف کیا ہے کہ رسولِ
[illegible] نے اہل سے عہد نامے کیے تھے، جن میں آپ نے عیسائیوں کی
[illegible] کو ان کے مذہب میں آزاد رہنے کا اور پادریوں کے
پرانے حقوق اور اختیارات کے بحال رہنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

حضرت عمرؓ نے بنو تغلب کی نسبت جو عیسائی تھے حکم دیا کہ ان پر کسی طرح کا دباؤ نہ ڈالا جائے۔ اور وہ اپنے مذہب کی پیروی میں بالکل آزاد رہیں۔ تغلب جزیہ ادا کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے درخواست کی کہ ان سے بھی اسی طرح پر محصول لیا جائے، جس طرح مسلمانوں سے لیا جاتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک اتنا اچھا تھا کہ جب ہرقل کو شکست ہوئی اور اس کی فوج شہر حمص کے قریب آئی تو شہر والوں نے جو عیسائی تھے فصیل کے دروازے بند کر لیے اور مسلمانوں سے کہا کہ ہم تمھاری حکومت اور تمھارے انصاف کو یونانیوں کی بے انصافی اور ظلم کے مقابلے میں بہتر جانتے ہیں۔ عیسائی ہر طرح مسلمانوں کے ساتھ معاشرت اور معاونت میں شریک رہتے تھے۔ اور تاریخوں سے ثابت ہے کہ مسلمانوں کی لڑائیوں میں عیسائی سردار مسلمانوں کی امداد کرتے تھے اور عیسائی ان کے لشکر میں شامل ہو کر داد شجاعت دیتے تھے۔ عیسائی اپنے مسلمان ہمسایوں کے ساتھ [illegible] رہتے تھے۔ عیسائی عرب لباس اور آدابِ معاشرت [illegible] کسی بات کا فرق نہ رکھتے تھے اور عیسائیوں اور مسلمانوں [illegible] مسلمانوں کی تاریخ میں ایسے بادشاہوں کی [illegible] جنھوں نے عیسائیوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ [illegible] مذہبی حقوق میں مداخلت نہیں کی اور ٹھیک

اسی طرح اچھا برتاؤ کیا جس طرح رسولِ خدا صلعم اور [illegible]
زمانے میں ہوتا تھا[۱۹]

حضرت عیسیٰؑ کا احترام

تاریخی اعتبار سے مسلمانوں اور عیسائیوں میں [illegible] وتعاون اور ہم آہنگی ثابت کرنے کے علاوہ سرسید نے اس بات کو واضح کیا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مذہبی عداوت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مذہب کی رُو سے مسلمانوں کو عیسائیوں کے ساتھ ہر قسم کی معاشرت کی، کھانے پینے میں ہو یا شادی بیاہ میں سوائے خفیف باتوں کے عام طور پر اجازت ہے۔ سوائے اسلام کے دُنیا میں اور کوئی مذہب نہیں جس نے حضرت عیسیٰ کا اور ان کی ہدایات کا ایسا ادب کیا ہو اور ایسی عزت کی ہو جیسی کہ مسلمان کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ مُسلمان حضرت عیسیٰؑ کو نبی برحق اور خدا کا رسول مانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میں اور عیسائی مذہب میں جو کلمۃ الحق ہے وہ ایک ہی ہے اور اس میں کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ "اے عیسائیو ایک بات پر آجاؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنے کے"۔ پس مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر جو کچھ عیسائیوں سے چاہا ہے وہ صرف یہی بات ہے کہ ہم اور تم دونوں مل کر ایک خدا کی عبادت کریں۔ خود عیسائیوں میں بھی کئی فرقے ہیں جن میں موحد بھی ہیں۔ پس مسلمانوں کے مذہب کے اعتبار سے جو اختلاف ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ خود عیسائی فرقوں میں ہے۔ مذہب کی رُو سے اور اس برتاؤ سے جو [illegible] بھی مسلمان عیسائیوں سے کرتے ہیں بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ [illegible] عیسائیوں میں کوئی مذہبی عداوت نہیں ہے۔ اس لیے [illegible] ازروئے مذہب عیسائیوں کے ساتھ مذہبی عداوت [illegible] غلط اور سراپا ناواجب ہے[۲۰]

[illegible] کھانا پینا مسلمانوں اور انگریزوں میں اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان [illegible] ایک دوسرے سے قریب آئیں باہم دوستی کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ کھائیں پئیں۔ لیکن اس وقت یہ حالت تھی کہ مسلمان انگریزوں سے ملنا جلنا پسند نہ کرتے تھے اور ان کے ساتھ کھانا پینا مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ کچھ لوگ انگریزوں سے معاشری تعلقات کی ابتداء کریں۔ چنانچہ سرسید نے خود ہی اس کا آغاز کیا۔ انگریزوں سے ملنا جلنا اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کیا اور اپنے دوستوں کو بھی انگریزوں کے ساتھ معاشرت و مواکلت اختیار کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لوگوں کے لیے یہ بات اس قدر عجیب تھی کہ انھوں نے سرسید کو "کرسٹان" کہنا شروع کر دیا۔ سرسید نے ایک انگریز کے ساتھ چائے پی لی تو ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان خانساماں نے انگریزوں کے ساتھ سرسید کو بھی کھانا کھاتے دیکھا تو مارے حیرت کے اس پر سکتے جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔

اور سرسید کے ترغیب دینے پر جب ان کے دوست محسن الملک نے انگریز کے ساتھ کھانا کھایا تو یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ عیسائی ہو گئے ہیں اور لوگوں نے ان سے ملنا جلنا۔ ان کے گھر آنا۔ سقے نے پانی بھرنا اور حلال خور نے کمانا چھوڑ دیا۔ تعصب اور جہالت کی اس کیفیت میں سرسید کے لیے یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے پر راضی کریں۔ لیکن سرسید اور ان کے دوستوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کے ہم خیال لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور رفتہ رفتہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے انگریزوں سے ملنا جلنا۔ ان سے ربط و [illegible] اور ان کے ساتھ کھانا پینا شروع کر دیا۔

طعامِ اہلِ کتاب جائز ہے [illegible]

ان کے ساتھ کھانے پینے کے سوال نے ایک شدید اختلافی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ عیسائی کے ساتھ کھانے پینے سے مسلمان کا مذہب جاتا رہتا ہے۔ اس غلط اور مہمل خیال کی تردید کر کے اسلامی احکام کے مطابق صحیح صورتِ حال کو پیش کرنے کے لیے سرسید نے "احکامِ طعامِ اہلِ کتاب" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں انھوں نے یہ بتلایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندوؤں کی ہزاروں رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے کو نہایت بُرا جانتے ہیں اور جو شخص اس کو مباح کہتا ہے یا اس پر عمل کرتا ہے اس کو کافر یا کرسٹان یا مسلمانوں کے گروہ سے خارج یا ایک بہت بڑے امرِ قبیح کا مرتکب سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کر کے وہ خود ہی گناہ گار ہوتے ہیں۔ کیونکہ طعامِ اہلِ کتاب بشرطیکہ محرماتِ شرعیہ میں سے نہ ہو، مسلمانوں کے لیے حلال اور درست اور اس کا کھانا جائز اور مباح ہے۔ خواہ ہم اہلِ کتاب کا بھیجا ہوا اور ان کا پکایا ہوا کھانا اپنے گھر کھاویں۔ خواہ ان کے ہاں جا کر کھاویں۔ خواہ ہم اکیلے کھاویں۔ خواہ ہم اور اہلِ کتاب ایک جگہ ساتھ بیٹھ کر کھاویں۔ اور وہ کھانا از قسم لحم و طبیخ سے ہو یا از قسم حبوب و شیرینی وغیرہ۔ طعامِ اہلِ کتاب اس لیے جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "آج حلال کی گئیں تمھارے لیے سب پاکیزہ چیزیں اور کھانا ان لوگوں کا جن کو کتاب دی گئی ہے حلال ہے تمھارے لیے اور حلال ہے ان کے لیے"[۲۱]

انگریز اہلِ کتاب ہیں [illegible]

اس آیت اور [illegible] سرسید نے [illegible] طعامِ اہلِ کتاب جائز ہے۔ اور [illegible]

[illegible] نہیں ہو سکتی۔ خود جناب رسولِ خدا
[illegible] ہوا کھانا تناول فرمایا ہے۔ اور حلال چیز کو
[illegible] مسلمان اور مشرک بھی، چہ جائیکہ اہلِ کتاب کھا دیں تو وہ
[illegible] نہیں ہو جاتی۔ رسولِ خدا صلعم نے کافروں کو بھی اپنے
[illegible] کھلایا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ زمانۂ حال کے انگریز اہلِ
کتاب میں داخل نہیں ہیں۔ سرسید نے قرآن پاک کے حوالوں سے یہ ثابت
کیا کہ اہلِ کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ ان پر توریت اور انجیل اتری
تھی۔ یہودی اور عیسائی آج بھی ان کتابوں کو مانتے اور اپنے تئیں حضرت موسیٰؑ
یا حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں سمجھتے اور ان کا تابع جانتے ہیں۔ اور اپنے تئیں
یہودی یا عیسائی کہتے ہیں۔ جس طرح کہ مسلمانوں کے تمام فرقے جو اپنے تئیں
پیغمبرِ خدا صلعم کی اُمت میں سمجھتے ہیں اختلافِ اعمال و عقائد کے باوجود اہلِ
قرآن ہیں اسی طرح تمام یہود و نصاریٰ اختلافِ اعمال و عقائد کے باوجود
اہلِ کتاب ہیں۔[۲۲]

چھری کانٹے سے کھانا بھی سنت ہے

سرسید نے یہ بھی ثابت کیا کہ طعام میں گوشت بھی
داخل ہے۔ اور قرآن و حدیث کے حوالے دے کر
بتلایا کہ اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہے، خواہ وہ اپنے
طریقہ پر ذبح کریں۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اسی طرح ذبح کریں جس طرح
کا حکم مسلمانوں کو ہے۔ اگر انگریز کے ہاں کا کھانا پکانے والا عیسائی یا مشرک
[illegible] بھی اس کے کھانے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔ کیونکہ ان میں کوئی
[illegible] ظاہری نہیں ہے۔ اور مسلمان یہ کھانا اسی طرح بلا تردد کھا سکتے
[illegible] ہندو حلوائیوں کی بنائی ہوئی مٹھائیاں کھاتے ہیں۔ سرسید
[illegible] کے یہاں کے پانی اور کھانے کے برتن بھی پاک
[illegible] کوئی ظاہری نجاست نہ ہو۔ انگریزوں کے

کھانا کھانے کے طریقے کو بھی سرسید نے [illegible]
بالکل درست بتلایا اور چھری کانٹے سے کھانا نہ صرف جائز [illegible]
دیا۔ کیونکہ حضورؐ نے گوشت کو چھری سے کاٹ کر اور اس کی نوک سے [illegible]
تناول فرمایا تھا۔ اس طرح سرسید نے انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا جائز
ثابت کیا اور ان کے ساتھ نہ صرف کھانے پینے بلکہ ان سے معاشری تعلقات
اور محبت و مودت و اتحاد قائم کرنا شریعت کی رو سے بالکل درست قرار دیا۔[۲۳]

سرسید کے عہد میں معاشرہ میں جو خرابیاں تھیں ان کو دور کرنے کے لیے
چند ایسی اصلاحات کرنے کی ضرورت تھی جن کے بغیر حالات کا درست
ہونا ممکن نہ تھا۔ اور باہمی اتحاد و تعاون، مذہبی رواداری اور معاشری
تعلقات کی بہتری بھی ان ضروری اصلاحات میں داخل تھیں۔ چنانچہ سرسید
نے اس بات کی ممکنہ کوشش کی کہ مسلمان اپنے عقائد میں اختلافات کو
نظر انداز کر کے اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مسائل پر متحد و متفق
ہو جائیں۔ ہندوستان میں رہنے والی قوموں میں اتحاد اور دوستی بڑھے اور
مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مختلف اسباب کی بنا پر جو تلخی اور
کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے۔ اور دونوں میں میل جول بڑھے
تاکہ پورے معاشرہ میں اتحاد و اتفاق اور دوستی و ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

حوالے:-

۱ تا ۳۔ سید احمد خاں کے لکچر و اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین۔ تقریر [illegible]

۴۔ مجلہ تہذیب الاخلاق۔ جلد پنجم۔ شمارہ ربیع الثانی [illegible]

۵۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ [illegible]

۶۔ آخری مضامین سرسید۔ مرتبہ [illegible]

۷۔ سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق [illegible]

[illegible] کے آخری مضامین۔ صفحہ ۷۰

[illegible] حیات جاوید۔ صفحہ ۸۷۳

۱۰۔ سفرنامۂ پنجاب (سید احمد خاں) مرتبہ سید اقبال علی۔ تقریر لدھیانہ۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۱۱۔ سفرنامۂ پنجاب (سید احمد خاں) جواب ایڈریس امرتسر۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۱۲۔ // // جواب ایڈریس لاہور۔ جنوری ۱۸۸۴ء

۱۳۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۱۹۴

۱۴۔ تحقیق لفظ نصاریٰ۔ سید احمد خاں۔ حیات جاوید صفحہ ۱۵۹

۱۵۔ تبیین الکلام۔ سید احمد خاں۔ //

۱۶۔ ماخوذ از رسالہ اسباب بغاوتِ ہندوستان۔ سید احمد خاں

۱۷۔ حیاتِ جاوید۔ صفحہ ۱۵۳

۱۸۔ مسافرانِ لندن (سید احمد خاں کا سفرنامہ) مجلس ترقی ادب لاہور۔ صفحہ ۴

۱۹۔۲۰۔ سرسید کے آخری مضامین۔ صفحہ ۵۳ تا ۵۸

۲۱ تا ۲۳۔ ماخوذ از رسالہ احکام طعام اہلِ کتاب۔ سید احمد خاں۔

نواں باب

عورتوں کے حقوق کا تحفظ

اصلاحِ معاشرت کے لیے سرسید کے خیالات اور ان کی عملی کوششوں کا ایک اہم پہلو عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ مسلمانوں کے زوال نے ان میں بہت سی دینی اور معاشری خرابیاں پیدا کر دیں۔ اور انھوں نے عورتوں کو ان حقوق سے بھی محروم کر دیا جو اسلام نے ان کو عطا کئے تھے۔ اسلام سے قبل اور اس کے بعد بھی صدیوں تک تمام غیر مسلم معاشروں میں عورت انتہائی پستی کی حالت میں رہی اور ترقی یافتہ قومیں بھی اس کو انسانی حقوق دینے پر آمادہ نہ تھیں۔ لیکن اسلام نے عورتوں کو معاشری، سیاسی، اقتصادی ہر قسم کے حقوق دے کر جنسی مساوات کے قیام کی راہ ہموار کر دی۔ اور مسلمان عورتوں کو ساتویں صدی میں ہی وہ حقوق حاصل ہو گئے جن کے لیے مغرب کی ترقی یافتہ قوموں کو انیسویں صدی تک جد و جہد کرنی پڑی۔ لیکن اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے وہ خود مسلمانوں نے ان سے چھین لیے اور رفتہ رفتہ مسلم معاشروں میں عورت محکوم و مظلوم بن گئی۔ عورتوں کو ان کے [illegible] حقوق اور ترقی کے مواقع سے محروم کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم [illegible] کی حالت بگڑ گئی اور مسلمان قوموں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں [illegible] ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اکثر اسلامی [illegible] بہت خراب تھی اور یہاں معاشری اصلاح [illegible]

[illegible] کوں کو ان کے تمام جائز حقوق اور ترقی کرنے کے [illegible] دلائیں اور ان کا تحفظ کیا جائے۔

اسلام کے عطا کردہ حقوق

ہندوستان میں مسلمان عورتوں کو ان کے حقوق دینے کے سلسلے میں سرسید کے پیش نظر دو اہم کام تھے۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ بتلانا کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں ان کو غصب کر کے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں اور دوسرے مغربی ممالک کے ان لوگوں کو جو اسلام کے مخالف ہیں اور مسلم معاشروں میں عورتوں کی پست حالت کو اسلامی تعلیمات کا نقص قرار دیتے ہیں، یہ بتلانا کہ اسلام نے درحقیقت عورتوں کو جو حقوق دیئے ہیں وہ ان حقوق سے بھی بہت زیادہ ہیں جو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں عورتوں نے بہت شدید اور نہایت طویل جد و جہد کے بعد حاصل کیے ہیں۔ اور مسلم معاشروں میں عورتوں کی پستی کا سبب دراصل یہ ہے کہ مسلمان زوال پذیر ہو گئے ہیں اور اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے انھوں نے عورتوں کو حقوق سے محروم کر دیا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے پہلے تو یہ بتلایا کہ انگلستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس وقت عورت کی قانونی حیثیت کیا ہے اور پھر ان حقوق کی تفصیل بیان کی جو اسلام نے عورتوں کو عطا کئے ہیں۔ اور آخر میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام کے دامن سے بدنامی کا داغ دھو کر اور اپنے معاشرے کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ [illegible] حقوق پھر واپس دیں جو اسلام نے ان کو عطا کیے ہیں۔

انگلستان میں عورتوں کی قانونی حیثیت

[illegible] حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے سرسید نے یہ

واضح کیا کہ تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت عمل [illegible]
اور مرد دونوں بہ اعتبار آفرینش کے مساوی ہیں۔ اور دونوں [illegible]
ہیں اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے
اگر تمثیلاً کہا جائے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور
مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے تو بھی وہ اس پر راضی نہیں ہوتے۔ بایں ہمہ ہم
دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی
ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے
اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جو عورتوں
کی آزادی کا بڑا حامی ہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں
ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر
اور لایعقل اور لاشے سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم وجود
متصور ہوتی ہے اور ذاتِ شوہر سے مبدل ہو جاتی ہے۔ وہ کسی قسم کے معاہدہ
کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور اس لیے وہ کسی دستاویز کی جو بلا شوہر کی مرضی
کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ ذاتی اسباب اور نقد و جائداد جو شادی
سے قبل عورت کی ملک ہو وہ شادی کے بعد شوہر کے قبضہ میں آجاتی ہے۔
عورت کو شادی سے قبل یا اس کے بعد وراثتاً جو جائداد ملے اس پر اس کا شوہر
قابض ہو جاتا ہے اور وہی اس کی آمدنی لیتا ہے۔ عورت لایعقل شخص کے
مانند نہ تو کسی پر دعوے کر سکتی اور نہ کوئی اس پر دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ شوہر
کی اجازت کے بغیر نہ کوئی چیز خرید سکتی ہے اور نہ بیع کر سکتی ہے۔ اور [illegible]
کھانے، کپڑا پہننے اور مکان میں رہنے کے خرچ کے سوا کوئی [illegible]
کے بغیر نہیں کر سکتی۔ گویا کہ عورت پر شادی [illegible]
مانند ہوتا ہے اور قانون کی نظر میں وہ [illegible]

مسلمان عورت کا مساوی مرتبہ

عورتوں کے متعلق انگلستان کے قانون سے اسلامی قانون کا مقابلہ کرکے سرسید نے یہ بتلایا کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس طرح عزّت دی گئی ہے۔ اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کئے گئے ہیں۔ حالت نابالغی میں مرد کی طرح عورت بھی بے اختیار اور ناقابلِ معاہدہ متصور ہوتی ہے لیکن بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار اور ہر ایک معاہدہ کے لائق ہوتی ہے۔ مرد کی طرح عورت بھی اپنی شادی کرنے میں مختار ہے۔ اور جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح عورت کی بے رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا۔ عورت اپنی تمام جائداد کی خود مالک اور مختار ہے اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدہ کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی ذات اور اس کی جائداد پر ان دستاویزوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جو وہ تحریر کرتی ہے۔ شادی سے قبل اور اس کے بعد جو جائداد عورت کی ملکیت میں آئے وہ خود اس کی مالک ہوتی ہے اور وہی اس کی آمدنی لیتی ہے۔ وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کرسکتی ہے اور اس پر بھی دعویٰ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے۔ اور جو چاہے بیع کرسکتی ہے اور مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کرسکتی ہے اور رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب وراثت ورثہ پاسکتی ہے۔ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کرسکتا ہے وہ عورت بھی حاصل کرسکتی ہے۔ اور تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں عورت بھی وہی سزائیں پاسکتی ہے جو مرد پاسکتا ہے۔ عورت پر کوئی خاص پابندی بجز اس کے جو خود اس نے بہ سبب معاہدۂ نکاح کے قبول کی ہیں یا اس تفاوت ستر عورت میں جو قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو۔

مسلمانوں کا طرزِ عمل

اسلام نے مسلمان عورتوں کو جو حقوق دیئے وہ مردوں نے غصب کرلیے اور اس کا لازمی نتیجہ

معاشری خرابیوں کی شکل میں نکلا۔ اور اسلام کو بھی بدنام کیا گیا۔ سرسید نے اس طرزِ عمل کے نتائج واضح کرنے کے لیے مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔ مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہونا چاہیئے تھا۔

تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کو بے پردگی کی جو آزادی ہے اس سے سرسید متفق نہیں۔ لیکن وہاں مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت اور تواضع اور خاطرداری اور محبت اور پاسِ خاطر اور ان کی آسائش و آرام کی طرف متوجہ ہونا اور ان کو ہر طرح خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گذار تصور کیا جائے ان کو اپنا انیس اور جلیس اور رنج و راحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور ان کو اپنی مسرت اور تقویت کا باعث سمجھنا قابلِ تقلید خوبیاں تصور کرتے ہیں اور اس بات پر متاسف ہیں کہ تربیت یافتہ ملکوں میں تو یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں۔ مگر مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا۔[۲]

مسلم معاشروں میں عورتوں کی حالت دیکھ کر اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی تردید کرتے ہوئے سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو اسلامی احکام کے مطابق عورتوں کو اُن کے حقوق دینے کی تلقین کی اور اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے اس کا اصلی باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے۔ اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں۔ بڑا باعث اس کا نامہذب

ہونا مسلمانوں کا ہے۔ مہذب قوموں نے باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچا یا ہے۔ اور مسلمانوں نے باوجودیکہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے بہتر اور عمدہ تھا اور انھوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں۔ اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔ پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھائیں۔"

عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ

سرسید تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے اور معاشری اصلاح اور قومی ترقی کے لیے اس کو لازمی قرار دیتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کے خاص حالات کے پیش نظر انھوں نے عورتوں کی تعلیم کے بارے میں جو طرز عمل اختیار کیا اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ سرسید تعلیم نسواں کے مخالف ہیں۔ وہ صرف لڑکوں کو جدید تعلیم دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم پر مطلق توجہ نہیں کرتے۔ اور تعلیم نسواں کو معاشرہ کے لیے نقصان رساں تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ سرسید کا یہ ہرگز مقصد نہ تھا کہ عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ پہلے لڑکوں کی تعلیم پر پوری توجہ صرف کی جائے۔ اور لڑکیاں جدید تعلیم کے بجائے بدستور پرانی تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ اور جب لڑکے نئی تعلیم و تربیت پوری طرح حاصل کرلیں تو پھر عورتوں کو ان کی ضرورت کے مطابق نئی تعلیم دی جائے۔

تعلیم نسواں کی حمایت

معاشرہ کی اصلاح و ترقی اور قوم کے عروج و استحکام کے لیے عورتوں کو تعلیم دینا کس قدر ضروری ہے اور عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے سے قوم کس قدر ترقی کر جاتی ہے اس کا سرسید کو پورا احساس تھا اور انھوں نے بار بار اس کا اعتراف بھی کیا۔ انگلستان میں قیام کے دوران میں انھوں نے انگریزی معاشرہ کے مختلف پہلوؤں کا بہت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور ان کی رائے یہ تھی کہ "تمام خوبیاں دینی اور دنیوی جو انسان میں ہونی چاہئیں وہ خدا تعالیٰ نے یورپ کو اور اس میں بالتخصیص انگلینڈ کو مرحمت فرمائی ہیں۔ وہ تمام کام ایسی خوبصورتی اور ایسی عمدگی سے انجام دیتے ہیں کہ کسی ملک میں اور کوئی مذہب والے اس خوبی و خوش اسلوبی و سلیقے سے نہیں کرتے۔ اور یہ نتیجہ ہے زن و مرد کے عموماً تعلیم یافتہ ہونے کا اور تمام قوم کا ان امور کی طرف متوجہ ہونے کا۔ اگر ہندوستان کے لوگ بھی عموماً تعلیم و تربیت پا جاویں تو ہندوستان بھی انگلستان سے زیادہ نہیں تو اس کے قریب قریب ہو جائے۔" کلفٹن میں رصد خانہ سیٹ و نسنٹ کو دیکھ کر سرسید حیران رہ گئے اور ان کو بڑی خوشی ہوئی کہ اس کا تمام انتظام ایک عورت کے سپرد تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سفرنامہ میں اس رصد خانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "شاید اس بات کو سن کر ہمارے زمانہ کے علماء اور فلسفی اور منطقی ضرور شرم کریں گے کہ یہ تمام کارخانہ ایک عورت کے سپرد ہے۔ اور جس قدر آلات کہ اب اس میں موجود ہیں اور جو جو عمل اس سے ہو سکتے ہیں وہ عورت کر کے دکھاتی ہے۔ میں دو دفعہ گیا اور اس عورت نے سب کام کر کے دکھلائے۔ مجھ کو تو اپنی سفید داڑھی پر اس عورت کے سامنے شرم آئی۔ مگر افسوس کہ ہمارے ہم وطنوں کو شرم بھی نہیں آتی۔"

لندن میں سرسید جس خاندان کے ساتھ رہتے تھے اس کی خواتین کا

ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "مسز لڈلم ایک بہت قابل اور تعلیم یافتہ۔ نہایت شائستہ اور نہایت پڑھی لکھی نہایت نیک بی بی ہے کہ اس کی خوبیاں مجھ سے بیان نہیں ہوسکتیں۔ تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت سب چیز کی مجسم ہے تمام کام اور تمام معاملات خانہ داری کے نہایت لیاقت سے خود کرتی ہے۔ اور مسٹر لڈلم کو بجز آفس میں جانے اور اپنے جلسوں میں شریک رہنے کے کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ مسز لڈلم کی دونوں بہنیں بھی اسی طرح پڑھی لکھی اور قابل ہیں۔ ان میں سے مس ایلن وسٹ کو کتابوں کے پڑھنے کا نہایت شوق ہے۔ چند روز ہوئے کہ وہ نہایت بیمار ہوگئی تھی۔ اور پلنگ پر سے اُٹھنے پھرنے کی طاقت نہ تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ جو کتابیں حال ہی میں تم نے متعلق مذہب مسلمانوں کے خریدی ہیں ان میں سے کوئی میرے پڑھنے اور دل بہلانے کو بھیج دو۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب بھیج دی۔ دو دن میں اس نے اس کتاب کو پڑھ ڈالا اور جب اس کو بالکل صحت ہوئی اور باہر آئی تو چند باتیں نہایت عمدہ اس کتاب میں سے بیان کیں۔" اس گھر کی نوکرانی این اسمتھ کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے لکھا ہے کہ "یہ نہایت ہوشیار اور پڑھی لکھی اور خوش خط باسلیقہ ہے۔ کتابیں پڑھ سکتی ہے۔ تمام ضروری مضمون لکھ سکتی ہے اخبار پڑھ سکتی ہے اور اُس سے خوشی حاصل کرسکتی ہے۔ اپنا متعلق کام اس خوبی سے انجام دیتی ہے کہ جیسے کوئی کل یا گھڑی بلا تفاوت باقاعدہ اپنا کام کرتی ہے۔"

"پس اب سمجھنا چاہیے کہ متوسط درجہ سے کس قدر کم درجہ کی عورتوں کی بھی کیسی عمدہ تعلیم ہے۔ کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ ایک عورت حالتِ بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے۔ آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجا کسی مرد اشراف کو بھی ایسی فصلت کا دیکھا ہے۔ اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو

کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہی مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور حلیۂ تربیت اور زیورِ تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے اور کمال نفرت اور کمال حقارت ان کے خیال میں گذرتی ہے۔" سرسید کے ان خیالات اور تاثرات سے بخوبی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے کس قدر حامی تھے اور قومی ترقی کے لیے اس کو کتنا ضروری خیال کرتے تھے۔

سرسید کا نقطۂ نظر عورتوں کی تعلیم کے اس قدر حامی ہونے کے باوجود سرسید ہندوستانی مسلمان لڑکیوں کو اسکولوں میں پڑھانے کے مخالف تھے اور لڑکوں کی طرح ان کو جدید علوم کی تعلیم دینا غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ اس کا سبب اس ملک کے خاص حالات تھے۔ جن کا اظہار سرسید نے متعدد موقعوں پر کیا تھا چنانچہ ۱۸۸۲ء میں جب کہ وہ قانون ساز کونسل کے ممبر تھے انھوں نے تعلیمی کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے مسلمان عورتوں کی تعلیم کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ "گورنمنٹ عملاً کوئی تدبیر ایسی اختیار نہیں کر سکتی جس سے اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو تعلیم کے واسطے گورنمنٹ اسکولوں میں بھیجنے پر مائل ہوں اور نہ کوئی ایسا اسکول قائم کر سکتی ہے جو کہ ان لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے لائق ہو۔ میں مسلمانوں پر یہ الزام نہیں لگاتا کہ وہ اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں نہیں بھیجتے۔ اور یقیناً کوئی اشراف یورپین بھی گو وہ کیسا ہی تعلیمِ نسواں کا شوقین ہو مسلمانوں پر ایسا الزام نہیں لگا سکتا۔ بشرطیکہ وہ اس ملک کے مدرسوں کی حالت سے واقف ہو۔ جس حیثیت اور وقعت کے مدارسِ نسواں ہندوستان میں ہیں اگر ایسے مدرسے انگلستان میں فرض کیے جائیں تو کیا اشراف خاندانوں کے انگریز اپنی لڑکیوں کو ان مدرسوں

میں بھیجنا پسند کریں گے۔ ہرگز نہیں۔ عورتوں کی تعلیم کا معاملہ اس فلاسفر کے سوال سے نہایت مشابہ ہے جس نے پوچھا تھا کہ پہلے مرغی پیدا ہوئی یا انڈا۔ جن شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔ جو کچھ گورنمنٹ کو بالفعل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے۔ جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہو جائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو خفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہش مند ہونگے۔ اگر گورنمنٹ مسلمان شریف خاندانوں میں تعلیم نسواں کے جاری کرنے کی کوشش کرے گی تو حالت موجودہ میں محض ناکامی ہوگی۔ اور میری رائے ناقص میں اس سے مضر نتیجے پیدا ہوں گے اور روپیہ اور محنت ضائع ہو گی۔"

عورتوں کی تعلیم کے متعلق سرسید کا یہ نظریہ ان کے پورے غور و فکر کا نتیجہ تھا جس پر وہ آخر تک قائم رہے اور ۱۸۹۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اس میں انھوں نے اپنے اس خیال کی پوری وضاحت کی اور کہا کہ "اس وقت ہم تمام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کا اقتظام نہیں کرتے اور اپنی اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔ خود ہندوستان کا حال دیکھو کہ کتنے خاندان جو

ذی علم تھے ان خاندانوں کی عورتیں کیسی تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ الزام کہ میں عورتوں کی تعلیم سے کنارہ کش ہوں محض غلط ہے۔ میری رائے میں عورتوں کی تعلیم کا ذریعہ مرد ہی ہوں گے۔ جب مرد لائق ہو جائیں گے تو سب ذریعے عورتوں کی تعلیم کے پیدا کر لیں گے۔ اور اسی لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ لڑکوں کی تعلیم ہو جائے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو اپنی بی بیوں اور بچوں اور عورتوں کو تعلیم سے آراستہ کریں گے۔"

عورتوں کی تعلیم کی نوعیت

عورتوں کی تعلیم کے متعلق سرسید نے جب ان خیالات کا اظہار کیا تو وہ انگلستان میں طویل قیام کر کے وطن واپس آچکے تھے۔ وہاں انھوں نے اس مسئلہ کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اور تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ انگلستان میں عورتوں کی تعلیم ہونے کی وہ بڑی تعریف کرتے تھے اور اس کو قومی ترقی کا ایک اہم اور بنیادی سبب قرار دیتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے حالات یورپ سے بالکل مختلف تھے اور اسی وجہ سے یہاں عورتوں کی تعلیم کے متعلق سرسید کی رائے بالکل مختلف تھی اور وہ اس رائے پر ہمیشہ سختی سے قائم رہے۔ اس کی وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے مخالف ہیں اور اسی سبب سے وہ اس پر کوئی توجہ نہیں کرتے۔ چنانچہ جب وہ پنجاب کا دورہ کر رہے تھے تو گورداس پور میں خواتین نے ان کو ایک سپاس نامہ پیش کیا تھا جس میں مسلمان عورتوں کی تعلیم کی طرف ان کو متوجہ کیا گیا تھا۔ اس سپاسنامہ کے جواب میں سرسید نے کہا تھا کہ "میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کو اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش

کرو۔ وہی طریقہ تمھارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔

"تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہوگئی ہو۔ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہوگئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو۔ میں نے لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں۔ بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں لڑکوں کے لیے کرتا ہوں وہ درحقیقت لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔"[۵۹]

سرسید کا خیال تھا کہ روٹی کمانے کے لیے مردوں کو زمانے کی مناسبت سے تعلیم کی ضرورت ہے لیکن عورتوں کی تعلیم کے مقصد میں چونکہ کوئی فرق نہیں ہوا ہے اس لیے ان کو موجودہ نامبارک کتابوں کے بجائے ان مقدس کتابوں کی ضرورت ہے جو ان کی دادیاں اور نانیاں پڑھتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے عورتوں کو نصیحت کی کہ "تمھارا فرض ہے کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو۔ اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو۔ اخلاق میں نیکی اور نیک دلی، رحم و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو اپنے برتاؤ میں لاؤ۔ گھر کا اہتمام اپنے ہاتھوں میں رکھو۔ اپنے گھر کی مالک رہو۔ اس پر مثل شہزادی کے حکومت کرو۔ اور مثل لائق وزیر زادی کے منتظم رہو۔ اپنی اولاد کی پرورش کرو۔ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دے کر اپنا سا بناؤ۔ خدا پرستی۔ خدا ترسی۔ اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی اپنا طریقہ رکھو۔ یہ تمام سچی تعلیم نہایت عمدگی سے ان کتابوں سے حاصل ہوتی ہے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی تھیں۔ جیسی وہ اس زمانے میں مفید تھیں وہی اس زمانے میں بھی مفید ہیں۔ پس اس زمانے کی مفید اور نامبارک کتابوں کی تم کو کیا ضرورت ہے۔ تمھارے خاندانوں کے

مردوں کی نالائقی اور جہالت سے تمہارے متعدد حقوق جو خدا کے حکم سے تم کو ملے ہیں اور جن کا انسانیت کی رُو سے تمہارا حق ہے برباد ہو گئے ہیں۔ اور وہ حق پھر تمہیں واپس دلانے کی بھی یہی تدبیر ہے کہ تمہارے لڑکوں کی تعلیم میں کوشش کی جائے جب کہ وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو وہ مغصوبہ حقوق از خود بے مانگے تم کو واپس ملیں گے۔[۵]

سرسید کی اس تقریر سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے تو حامی تھے مگر ہندوستان کے حالات کے پیشِ نظر ان کے لیے مذہبی و اخلاقی تعلیم اور خانہ داری کی تربیت کو کافی سمجھتے تھے۔ اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مردوں کے تعلیم یافتہ بن جانے سے عورتوں کی عام تعلیم کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اور تعلیم یافتہ مرد عورتوں کی تعلیم پر پوری توجہ کریں گے۔

زنانہ مدارس کا سوال

مارچ ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا جس میں تعلیم نسواں کی تائید میں ایک قرارداد پیش کی گئی تھی۔ اس قرارداد کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ "بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں لیکن عورت کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہمارے قدیم بزرگوں کے تھے۔ جو جدید انتظام عورتوں کی تعلیم کا اس زمانے میں کیا جاتا ہے خواہ وہ گورنمنٹ کا ہو خواہ اس کا انتظام کوئی مسلمان یا کوئی انجمنِ اسلامی کرے اس کو میں پسند نہیں کر سکتا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسوں کا قایم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کرنا ہندوستان کے موجودہ حالات کے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور میں اس کا سخت مخالف ہوں۔ لوگوں نے یہ بات سُنی ہے کہ انگلستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مدرسے ہیں اور وہ اسی طرح ان میں جمع ہو کر پڑھتی ہیں جس طرح کہ لڑکے مدرسوں میں جمع ہو کر پڑھتے ہیں اور رہتے ہیں۔ میں نے ایسے زنانہ مدرسوں کو

جہاں اشراف کی لڑکیاں پڑھتی اور رہتی تھیں دیکھا ہے۔ اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت عمدگی اور طمانیت اور تعلیم کی ان مدرسوں میں ہے ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی سینکڑوں برس درکار ہیں۔ اگر فرض کرو کہ ایسے ادارے ہندوستان میں ہوں تو میں ہر اشراف خاندان سے کہوں گا کہ بے شک اپنی لڑکیوں کو وہاں بھیجو۔ لیکن میں یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان میں ابھی یہ ہونا محال ہے۔"[۱۰]

عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھانے کا خیال پیدا ہوا تھا سرسید نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اور ان کو اپنے حالات اور ضروریات کے لیے ناموزون اور غیر مفید قرار دے کر کہا کہ یورپ کی اور امریکہ کی حالتِ معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضروری ہوں جو ہمارے شرفاء میں لڑکیوں کی تعلیم میں داخل نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلیگراف ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں۔ لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔ سرسید کے ان خیالات کی بنا پر لوگ ان کو سمجھنے میں غلطی کرتے اور تعلیم نسواں کا مخالف سمجھتے تھے۔ مگر ان کی تحریروں اور تقریروں سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے بڑے حامی تھے اور اس کو قومی ترقی کے لیے ضروری تصور کرتے تھے۔ انگلستان میں لڑکیوں کے اسکولوں کو وہ بہت پسند کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ ان مدرسوں کو اس ملک کے لیے نقصان رساں سمجھتے تھے۔ حالات کی تبدیلی نے لڑکوں کے لیے جدید قسم کے اداروں میں نئے علوم کی تعلیم حاصل کرنا لازمی بنا دیا تھا لیکن لڑکیوں کے حالات میں ایسی تبدیلی نہیں ہوئی تھی کہ جن کی وجہ سے پرانے طریقۂ تعلیم کو جو بہت مفید تھا بدل دینے کی ضرورت ہوتی۔ اس لیے سرسید نے لڑکوں کو جدید قسم کے اداروں میں نئے علوم کی تعلیم دینے کے لیے پوری جدوجہد کی۔ لیکن لڑکیوں کے لیے پرانا طریقۂ تعلیم برقرار رکھنے کی تائید

کرتے رہے۔ لڑکیوں کے لیے وہ جدید علوم کو بھی ناموزوں تصور کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں وہ زمانہ سینکڑوں برس بعد بھی نہ آئے گا کہ عورتوں کو جدید علوم کی ضرورت ہو اور وہ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہاں سرسید کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ان کے بعد دنیا نے جس حیرت انگیز رفتار سے ترقی کی وہ اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں وہ جن تبدیلیوں کو سینکڑوں برس بعد بھی ناممکن خیال کرتے تھے وہ پچیس تیس سال کے اندر رونما ہو گئیں۔

حالات کا تقاضہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں سرسید نے جو مختلف طرزِ عمل اختیار کیا اس کی مصلحت انھوں نے مولوی ممتاز علی صاحب کے نام ایک خط میں بیان کی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید عورتوں کو اعلیٰ اور جدید تعلیم دینے کے بڑے حامی تھے مگر پورے معاشرہ کے بگڑے ہوئے حالات کو ملحوظ رکھ کر عورتوں کی تعلیم میں فوری اور بنیادی تبدیلی کے خلاف تھے تاکہ گھریلو زندگی میں ہم آہنگی برقرار رہے اور تعلیمی اصلاح و ترقی کا کام رفتہ رفتہ انجام پائے۔ اس خط میں سرسید نے یہ واضح کیا ہے کہ "میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورات کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی جائے۔ مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دینا ہے۔ کنواری لڑکیاں تمام عمر بے شادی کے بلحاظ حالاتِ ملک نہیں رہ سکتیں اور نہ ان کی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ پس ضرور ان کی شادی کرنی ہوگی۔ ہماری قوم کے لڑکوں کی جو ابتر و خراب حالت ہے اور بدعادتیں اور بداعمال ان کے ہیں اور بداخلاق اور بدطریقہ ان کا اپنی جوروؤں کے ساتھ ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس وقت تمام اشراف خاندانوں میں ایک لڑکا بھی نیک چلن اور خوش اخلاق، مہذب و تعلیم یافتہ نہیں نکلے گا جو اپنی جورو کو

ایک انیس غم گسار سمجھے۔ کل خاندانوں کے لڑکوں کا یہ حال ہے کہ جوروؤں کو لونڈیوں سے بدتر سمجھتے ہیں اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں جو جوروؤں کے ساتھ نہیں برتتے۔ اب خیال کرو کہ بے تربیت لڑکی پر یہ مصیبت صرف ایک حصّہ ہے۔ اس کو خود خیالات عمدہ و تہذیب کے نہیں ہیں اس لئے اس کو اپنے خاوند کی بداخلاقی صرف بقدر ایک حصّہ کے رنج و مصیبت میں رکھتی ہے۔ اور جب کہ وہ اپنی تمام ہمسروں کا یہی حال دیکھتی ہے تو کسی قدر تسلّی پاتی ہے۔ اور اس کے ماں باپ جب اس کی حمایت کرتے ہیں تو اس کے دل کو زیادہ تشفی ہوتی ہے۔ مگر جب وہ خود شائستہ و مہذّب و تربیت یافتہ اور عالی خیال ہو تو یہ تمام معلومات اس کی روح کو بہت زیادہ رنج دیتے ہیں اور اس کی زندگی بلائے جان ہو جاتی ہے۔ عورات کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفتِ بے درماں ہے۔ شائستہ و تربیت یافتہ مرد کو ناتربیت یافتہ جوان عورت ملنے سے اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ وہ اپنی تہذیب کے سبب اپنی جورو سے محبت کرتا ہے اور اس کو مہذب و شائستہ بنا لیتا ہے۔ اس وقت دو ایک مثالیں خاندان میں ایسی موجود ہیں کہ اُنھوں نے اپنی بیویوں کو ایسا پڑھا لکھا لیا ہے اور تعلیم یافتہ کر لیا ہے کہ بلاشبہ وہ عورتیں انیسِ غم گسار ہونے کے لائق ہو گئی ہیں۔ پس بالفعل عورتوں کو ایسا رکھنا چاہیئے کہ اگر ان کے شوہر مہذب ہوں تو ان کو مہذّب کر سکیں اور اگر نامہذّب ہوں تو ان کی بیویاں بھی ویسی ہی ہوں۔"[۱۱]

اصلاح کا طریقہ سرسید کی ان تحریروں، تقریروں اور بیانوں سے بخوبی یہ وضاحت ہوتی ہے کہ وہ معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے عورتوں کے حقوق کے تحفّظ اور ان کی فلاح و ترقی کو کس قدر اہمیّت دیتے تھے۔ ان کا یہ نظریہ تھا کہ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق

عطا کئے ہیں وہ ان حقوق سے بہت زیادہ ہیں جو مہذب مغربی ممالک میں عورتوں کو حاصل ہیں۔ ان ممالک میں عورتوں پر اس زمانے میں جو پابندیاں عائد تھیں ان کے باوجود اُنھوں نے بہت ترقی کی تھی کیونکہ مغربی معاشرہ میں عورتوں کو ترقی کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں عورتوں کی حالت اس لیے پست تھی کہ وہ معاشری حقوق اور ترقی کے مواقع سے محروم تھیں۔ سرسید نے اپنی قوم کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ مسلمان عورتوں کو وہ حقوق دیئے جائیں جو اسلام نے ان کو عطا کیئے ہیں۔ ان کی مذہبی و اخلاقی تعلیم اور تربیت پر پوری توجہ کی جائے۔ اور مسلمان لڑکوں کو جدید تعلیم دے کر اس قدر مہذب بنا دیا جائے کہ وہ عورتوں کو جدید تعلیم دینے کی اہمیت کو محسوس کر کے وہ رکاوٹیں دور کر دیں جو معاشرہ کے بگڑے ہوئے حالات نے پیدا کر دی ہیں۔ مسلمانوں کی قومی ترقی اور معاشری اصلاح کی کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی تھیں جب مسلمان اپنے معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت بلند کرتے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید کے نزدیک پہلی ضرورت یہ تھی کہ عورتوں کو اسلامی حقوق واپس دے کر ان کے معاشری مرتبے کا تحفظ کیا جائے۔ اور مردوں کو جدید تعلیم دے کر مہذب بنایا جائے۔ اور جب یہ کوشش کامیاب ہو جائے تو پھر عورتوں کو بھی نہایت عمدہ اور اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ تاکہ زوال پذیر معاشرہ فوری تبدیلیاں کر کے ناکام ہونے کے بجائے درجہ بدرجہ ترقی کرے۔ اور نیا مہذب معاشرہ مستحکم بنیادوں پر تعمیر کیا جا سکے۔

حوالے

۳۔ سرسید کے مضامین۔ تہذیب الاخلاق۔ مرتبہ ملک فضل الدین۔ صفحہ ۹۰ تا ۷۳

۴۔ مسافرانِ لندن (سرسید احمد خاں کا سفرنامہ) مجلس ترقی ادب لاہور۔ صفحہ ۱۷۱

۵۔ مسافرانِ لندن۔ صفحہ ۱۸۹
۶۔ حیاتِ جاوید۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۲۹۷
۷۔ سید احمد خاں کے لکچرز و اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین گجراتی۔ تقریر اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڑھ ۱۸۹۱ء
۸۔۹۔ سفرنامۂ پنجاب۔ (سید احمد خاں) مرتبہ سید اقبال علی۔ جواب ایڈریس خاتونانِ پنجاب۔ گورداسپور۔ جنوری ۱۸۸۴ء
۱۰۔ سید احمد خاں کے لیکچرز و اسپیچز۔ تقریر لاہور۔ مارچ ۱۸۸۸ء
۱۱۔ مکتوباتِ سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔ صفحہ ۳۸۰

تتمّہ

ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی زوال، سلطنت مغلیہ کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے بعد مسلمانوں کو انگریز حکمرانوں کے شدید مظالم، سیاسی غلامی اور معاشی تباہی نے بے شمار مصائب و مشکلات میں مبتلا کر دیا تھا اور سرسید بھی قدرتی طور پر اپنی قوم کی بدحالی و بربادی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ لیکن انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن حالات میں بھی وہ مستقبل سے مایوس اور احساسِ شکست سے مغلوب نہ ہوئے اور اپنی قوم کے زوال اور تباہی کے اسباب کا جائزہ لے کر تمام خرابیوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے اور تاریک مستقبل کو روشن بنانے کا آہنی عزم لے کر میدانِ عمل میں اُتر آئے۔

سرسید بہت دور اندیش اور حقیقت پسند تھے اور انھوں نے اس بات کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو نہ صرف سیاسی و معاشی مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان کی دینی اور معاشری حالت بھی اس قدر بگڑ چکی ہے کہ اگر حالات کو سدھارنے اور ان پر قابو پانے کی مناسب تدبیریں اختیار نہ کی گئیں تو اس ملک میں مسلمانوں اور اسلام دونوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ سرسید کا اصل مقصد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو بہتر بنانا اور ایک باعزت قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کا تحفظ کرنا تھا۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو منصوبہ بنایا اور جو تحریک شروع کی وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھی اور سیاست، معاشرت

معیشت، دین، اخلاق، تعلیم، ثقافت، غرض کہ زندگی کے تمام اہم شعبوں کی اصلاح و ترقی اس کے دائرۂ عمل میں شامل تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت بڑا اور بہت مشکل تھا اور اس قدر ناموافق حالات میں کامیابی کی امید بھی برائے نام تھی، لیکن سرسید بڑے باعزم و باہمت انسان تھے۔ وہ اپنے مقصد پر پوری ثابت قدمی سے اڑے رہے اور رفتہ رفتہ اپنی اصلاحی کوششوں کو ایک ملک گیر تحریک بنا کر حصولِ مقصد کی راہ ہموار کر لی۔

معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کے لیے سرسید نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کو عملاً کامیاب بنانے کے لیے قوم میں ایک ذہنی و عملی انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ اور بہت غور و فکر کے بعد سرسید اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قوم میں یہ انقلاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب نئی نسل کو صحیح قسم کی تعلیم دی جائے۔ اس وقت ہندوستان میں قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیم ناقص تھی۔ اور مسلمانوں کو ان دونوں سے نقصان پہنچ رہا تھا۔ قدیم طرز کی تعلیم نئے حالات میں بالکل بے کار تھی۔ اس سے زندگی کے مسائل حل کرنے میں کوئی مدد نہ ملتی تھی اور نتائج کے اعتبار سے یہ قوم کے لیے جہالت سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور جدید تعلیم میں بڑی خرابی یہ تھی کہ اس کا بنیادی مقصد انگریز حکمرانوں کے سامراجی مقاصد کو تقویت پہنچانا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس ملک میں لادینی تعلیم کا جو نظام قائم کیا تھا اس کی برائیوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا بہت دشوار تھا۔ اور اس تعلیم کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ تعلیم یافتہ مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو فراموش کر دیں کہ وہ ایک درخشاں ترین ماضی اور ایک عظیم ترین روحانی و اخلاقی تہذیب کے وارث ہیں اور انسان کے فکری و ذہنی ارتقاء، علوم و فنون کے فروغ اور تہذیب و ثقافت کی ترقی میں ان کے آبا و اجداد کے کارنامے بہت

نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ لادینی تعلیم سے مسلمانوں کو یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان اسلام کے بنیادی مقاصد اور اس کے اصول و نظریات کی حکمت و حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکیں گے اور یہ لاعلمی ان لوگوں کے ذہن میں دینی صداقتوں کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر دے گی اور وہ مذہب کو دنیاوی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ تصور کرنے لگیں گے۔

مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں کے لیے جدید تعلیم ہر لحاظ سے بہت مفید تھی اور وہ اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ چونکہ ہندو مذہب محض رسوم و رواج اور توہمات کا مجموعہ ہے اور زندگی کے مقاصد و مسائل اور ترقی پذیر معاشرہ کے تقاضوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اس لیے ہندوؤں کے مذہب اور لادینی تعلیم میں کوئی تصادم نہیں تھا۔ بلکہ مغرب کے نئے لادینی تصورات ہندو معاشرہ کی فلاح و نجات اور اصلاح و ترقی کے لیے بہت ضروری اور مفید تھے۔ اور ان کو اختیار کر کے ہندو قوم معاشری وقار حاصل کر سکتی تھی۔ چنانچہ ہندوؤں نے جدید تعلیم کو اس بنا پر خوشی سے قبول کر لیا تھا کہ یہ ان کی معاشی خوش حالی، معاشری اصلاح اور ذہنی تربیت کا نہایت مؤثر ذریعہ بن جائے گی اور مغربی نظریات ہندو معاشرہ کے بہت سے خلاؤں کو پُر کر دیں گے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے جدید تعلیم کے ان متضاد نتائج نے بھی مسلمانوں کے سامنے ایک اہم مسئلہ پیش کر دیا تھا۔ اور نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے بھی اس کو حل کرنا ضروری تھا۔

سرسید قدیم اور جدید دونوں قسم کی تعلیم کے تمام نقائص سے بخوبی واقف تھے اور اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ جدید تعلیم کا مقاطعہ کر کے مسلمان تعلیم میں ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اگر وہ نئے علوم و فنون سے اسی طرح غافل رہے تو ذہنی و علمی ترقی، معاشی خوش حالی اور نئے

معاشرہ میں باعزت وباوقار مرتبہ حاصل کرنے سے محروم رہیں گے اور ان کا مستقبل تاریک تر ہو جائے گا۔ ان تمام حالات کے پیشِ نظر سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ تمام جدید اور مفید علوم اور اس کے ساتھ ہی اسلام کی صحیح تعلیمات اور زندگی کے اعلیٰ اصول و مقاصد سے پوری طرح واقف ہو جائیں اور ملک اور معاشرہ کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق تمام اہم مسائل کو بخوبی حل کر سکیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم پر پوری توجہ کی اور اپنے مقاصد و نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے علی گڈھ کالج قائم کر دیا جو ان کی اصلاحی تحریک کا مرکز و محور بن گیا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کو جن خطرات کا سامنا تھا ان میں انگریز حکمرانوں کی سیاسی پالیسی بھی مسلمانوں کے حق میں بڑی تباہ کن تھی۔ اور سرسید کو اس مسئلہ پر بھی خاص توجہ کرنی پڑی۔ مسلمان اور انگریز دونوں ایک دوسرے سے بدگمان اور متنفر تھے۔ کیونکہ مسلمان انگریزوں کو اپنا دشمن اور اپنی تباہی کا باعث سمجھتے تھے اور انگریز مسلمانوں سے خائف تھے اور اپنی حکومت کے لیے ان کو بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے۔ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی سلطنت پھر حاصل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے اور سراج الدولہ، میر قاسم، حیدر علی اور ٹیپو سلطان جیسے حریت پسندوں کی شدید مقاومت اور ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی زبردست جدوجہد کی بنا پر انگریز اپنے اس اندیشے کو ایک حقیقت سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو کمزور رکھنے کے لیے انھوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کرنے کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ یہ پالیسی مسلمانوں کے لیے اس وجہ سے اور زیادہ خطرناک تھی کہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں تھے اور انگریز یہ چاہتے تھے کہ مغربی جمہوریت اور وطنی قومیت کے تصورات پر مبنی اکثریت کی

حکومت کے نظریہ کو ہندوستان میں بھی بتدریج روبہ عمل لایا جائے۔ انگریز حکمرانوں نے اپنی پالیسی میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا، کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد ہیں۔ اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت نہیں بلکہ جداگانہ قومیں ہیں۔ انگریز اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت چونکہ مذہب پر مبنی ہے اس لیے یہ دائمی اکثریت ہے۔ اور اگر اس مذہبی اکثریت کو سیاسی اکثریت قرار دے کر حکومت اس کے حوالے کر دی گئی تو یہ عمل جمہوریت اور اس کے اصول و مقاصد کے بالکل برعکس ہوگا اور ایک دائمی اکثریت کی یہ حکومت جمہوری کے بجائے استعماری ہوگی۔ لیکن انگریز اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت اور ہندو اپنے مفاد کے پیش نظر اس غیر جمہوری طرز عمل کو جمہوری قرار دینے پر ہمیشہ اصرار کرتے رہے۔ اپنی اسی پالیسی کے مطابق انگریزوں نے ہندوستان کو نئی قسم کے نظام حکومت سے آشنا کیا اور انڈین نیشنل کانگرس بھی قائم کی جس کی سرگرمیوں میں ہندو بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ ادارہ جمہوری اور قومی حقوق کا نام لے کر جو کچھ مانگ رہا ہے وہ اگر مل گیا تو اس سے صرف ہندو ہی فائدہ اٹھائیں گے اور ہندوستان کی دوسری قوموں پر ان کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔

اس زمانے کے مسلمان جن کی قوم اقلیت میں ہونے کے باوجود اس ملک پر سیکڑوں سال تک حکومت کر چکی تھی، قدرتی طور پر نہ تو اکثریت کی حکومت کے نظریہ کو سمجھ سکتے تھے اور نہ مغربی نظام حکومت سے آشنا تھے۔ اور ان میں اتنا سیاسی شعور بھی نہ تھا کہ وہ انگریزوں کی اس پالیسی کے مضمرات سے آگاہ ہو سکتے۔ تاہم اس قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو غور و فکر کی صلاحیت اور سیاسی بصیرت رکھتے تھے، انگریزی نظام حکومت اور

سیاسی پالیسی کے خطرناک نتائج کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ایک قوم کے تصور پر مبنی جمہوری نظام مسلمانوں کے لیے نقصان رساں ہے۔ یہی سبب ہے کہ سید امیر علی اور محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کے دوسرے رہنما مسلمانوں کی ایک الگ سیاسی جماعت قائم کرنا بہت ضروری خیال کرتے تھے اور سید امیر علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں محمڈن نیشنل ایسوسی ایشن کی شاخیں ایک مرکزی کانفرنس منعقد کر کے مسلمانوں کے جداگانہ قوم ہونے کا اعلان کر دیں اور انڈین نیشنل کانگریس اور انگریز دونوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو جداگانہ سیاسی و معاشی حقوق دینے کا مطالبہ کریں۔

سرسید انگریزوں سے تعاون اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ انگریزوں سے تعاون کی پالیسی پر تو وہ آخری دم تک کاربند رہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور آخر کار وہ بھی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور ان کے قومی حقوق کے تحفظ کی حمایت کرنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزوں سے تعاون، مصالحت اور دوستی بڑھانے کی کوشش میں سرسید انتہائی حدود سے بھی تجاوز کر گئے اور مخالفین نے ان پر انگریز پرستی کا الزام عائد کر دیا لیکن یہ طرزِ عمل ان حالات اور واقعات کا منطقی نتیجہ تھا جو سرسید کی نظروں کے سامنے تھے۔ سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور کے حالات اور ۱۸۵۷ء کی شورشِ عظیم کے نتائج دیکھ کر سرسید نے یہ رائے قائم کی تھی کہ ہندوستان کے زوال پذیر مسلمان انگریزوں جیسی ترقی یافتہ اور طاقتور قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اگر ان میں پھر تصادم ہوا تو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔ مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ انگریزوں سے خوشگوار روابط قائم کریں اور ان کی حکومت سے جو فوائد حاصل ہو سکتے ہیں ان سے پوری طرح اور صحیح طور پر کام لے کر

اپنی قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے کوشش کریں۔ کیونکہ موجودہ حالات میں اس قوم کے لیے یہی سب سے اہم مسئلہ ہے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد و اتفاق قائم رہنے کے امکانات سے سرسید اس لیے مایوس ہو گئے تھے کہ سیاسی حالات فرقہ واری تعصب کو ہوا دے رہے تھے۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے سیاسی و معاشی حقوق، تہذیب و ثقافت، قومی روایات اور اردو زبان کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ ہندوؤں نے معاندانہ روش اختیار کر لی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر سرسید کو یقین ہو گیا کہ اب دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ اور ان میں مخالفت و عناد روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔ یہ دونوں قومیں اقتدار میں برابر کی حصہ دار نہ ہو سکیں گی بلکہ ایک قوم دوسری قوم پر مسلّط ہونے کی کوشش کرے گی۔ چنانچہ سرسید مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے جداگانہ کوششوں کو لازمی تصور کرنے لگے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کانگریس جس قدر زیادہ طاقت حاصل کرے گی وہ مسلمانوں کے لیے اتنی ہی زیادہ نقصان رساں بن جائے گی۔ اس لیے انھوں نے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کی۔ اور ایسی منظم و مؤثر جدوجہد کرنے پر زور دیا جو تخریب و تصادم کے بجائے تعمیر و تعاون پر مبنی ہو اور مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کر کے برطانوی نظامِ حکومت میں ایک باعزت قوم کی حیثیت حاصل کر لیں۔ سید امیر علی اور سید احمد خاں جیسے دور اندیش رہنماؤں نے حالات کا اندازہ کر کے جو رائے قائم کی تھی وہ درست ثابت ہوئی۔ ہندوؤں کے طرزِ عمل اور فرقہ واری تعصب نے قومی اتحاد کا رشتہ توڑ ڈالا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے باعزت قومی وجود اور اپنے ملّی حقوق کی حفاظت کے لیے اپنی ایک الگ سیاسی تنظیم قائم کر لی اور اس برِعظیم میں مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا قیام ان کا

کی نصب العین بن گیا۔

ان تمام خطرات اور مشکلات کے علاوہ جو انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کا نتیجہ تھے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ خود مسلمان اسلام کی صحیح تعلیمات سے بہت دور ہو گئے تھے۔ اور غیر اسلامی اثرات نے ان کے عقائد و نظریات اور دینی تصورات کو بُری طرح مسخ کر دیا تھا۔ ہر زمانے میں وہی نظریۂ حیات قابلِ قبول ہوتا ہے جو اس زمانے کے اہم مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جن نظریات میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ زمانے کے تقاضوں کو ان سے ہم آہنگ کیا جا سکے وہ نظریات یا تو ترک کر دیے جاتے ہیں یا ان کو اختیار کرنے والی قوم زوال و پستی کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سر سید کے زمانے میں مسلمانوں کا تصورِ مذہب نہایت محدود، جامد اور روایتی ہو گیا تھا اور وہ اس حقیقت کو بھول گئے تھے کہ اسلام ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی رہبری کر سکتا ہے اور ایک ترقی پذیر انسانی معاشرہ کے تقاضے ہر زمانے میں اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی اس گمراہی کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے بگڑے ہوئے عقائد اور نظریات کو درست کرنے کے بجائے اپنے غیر اسلامی معتقدات، رسوم و رواج اور توہمات کو برقرار رکھنا اور ان کی حفاظت کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے اسلام کے مخالفوں اور عیسائی مبلغوں کو، جو حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے، اسلام کے خلاف پروپگنڈہ کرنے کے وسیع مواقع مل گئے تھے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں یہ غلط خیال پھیلایا جا رہا تھا کہ اسلام کے فرسودہ اصول موجودہ زمانے کے لیے بے کار ہیں اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس پروپگنڈہ نے قدرتی طور پر نوجوانوں کے تجسس پسند ذہن میں اسلامی تعلیمات کے

متعلق شکوک وشبہات پیدا کر دیے تھے اور اس بات کا امکان یقینی نظر آتا تھا کہ اگر ان شبہات کا تسلی بخش جواب دے کر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو اسلام کی صحیح تعلیمات اور اس کے اصولوں کی حکمت سے ناواقف مسلمان بھی اپنے مذہب سے بدگمان ہونے لگیں گے اور یہ بدگمانی الحاد وارتداد کے دروازے کھول دے گی۔

مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال سیاسی غلامی، معاشی تباہی، اور معاشری پستی سے کم خطرناک اور برباد کن نہ تھی۔ لیکن اس کو نہ تو عام مسلمان محسوس کرتے تھے اور نہ مذہبی طبقہ میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ ایسے نازک وقت میں عوام کی صحیح رہبری کر سکتا۔ اس لیے کہ مذہب کے معاملے میں یہ طبقہ نہایت تنگ نظر اور جمود پسند تھا اور اس کی دینی سرگرمیاں مناظرہ بازی اور کافر سازی تک محدود تھیں۔ چونکہ یہ لوگ مذہب کی روح اور اس کے مقاصد سے ناآشنا اور اس کے اصولوں کی حکمت وافادیت سے بیگانہ تھے اس لیے وہ نہ تو دینی احکام ومسائل کو صحیح طور پر بیان کر سکتے تھے اور نہ مخالفوں کے اعتراضات کا معقول جواب دے سکتے تھے۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے آگاہ کر کے ان کے بگڑے ہوئے عقائد درست کیے جائیں اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے دینی افکار ونظریات کی اس طرح از سر نو تشکیل کی جائے کہ وہ نئے دور کے بدلے ہوئے حالات میں زندگی کے اہم مسائل کو حل کر سکیں اور معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح وترقی میں مدد دیں۔ اس اہم تقاضے کو سرسید نے پوری طرح محسوس کیا اور اسلامی تعلیمات کی تشریح وتاویل کو بھی اپنی اصلاحی تحریک کا ایک بنیادی مقصد بنا لیا۔ اس کوشش میں سرسید سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں اور ان کی بعض تاویلوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں میں دینی شعور پیدا

کرنے میں سرسید نے نمایاں حصہ لیا ہے اور اسلامی افکار کی از سرِ نو تشکیل اور اسلامی نظریۂ حیات کی تجدید کے لیے اقبال نے مسلمانوں میں جو ذہنی و فکری انقلاب پیدا کر دیا اس کا آغاز کرنے والوں میں سرسید کو بھی ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی تعلیمی ترقی، ان کے ملی حقوق کا تحفظ اور اسلامی افکار کی تشکیلِ جدید سرسید کی اصلاحی تحریک کے بنیادی مقاصد بن گئے۔ اور چونکہ اردو زبان کو سرسید مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کی اساس اور قومی اتحاد کی ضمانت تصور کرتے تھے اس لیے اردو کی ترویج و ترقی اور تحفظ کو بھی انھوں نے اپنی تحریک میں بہت نمایاں اہمیت دی اور اس کے مخالفوں کا اس شدت سے مقابلہ کیا کہ آخر کار یہی مسئلہ ان کے سیاسی نظریات اور نصب العین میں تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس کے علاوہ معاشرہ کی خرابیاں دور کرنے کے لیے سرسید رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت میں اصلاح و ترمیم اور عورتوں کے حقوق کی حفاظت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور قومی اتحاد و ملی استحکام کے لیے مذہبی رواداری اور مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کو لازمی سمجھتے تھے اس لیے ان مقاصد کے حصول پر بھی انھوں نے پوری توجہ کی تاکہ ہر قسم کی خرابیاں دور کر کے ایک ایسا ترقی پذیر معاشرہ تعمیر کیا جا سکے جو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ غرض کہ سرسید کے پیشِ نظر معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا ایک ہمہ گیر منصوبہ تھا جس کو عملی شکل دینے کے لیے انھوں نے ایک منظم تحریک شروع کی تھی۔ اور اس تحریک کو مستحکم بنانے، آگے بڑھانے اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق نئی نسل کو عمدہ تعلیم و تربیت دینے کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں جو کالج قائم کیا تھا وہی ان کی تمام جد و جہد کا مرکز بن گیا۔ اس کالج نے آگے چل کر مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی اور جو اہمیت، وقار، ناموری اور کامیابی اس یونیورسٹی نے حاصل کی وہ ہندوستان کی کسی اور یونیورسٹی کو نصیب نہ ہو سکی۔

اس طرح علی گڑھ ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بن گیا اور سرسید کے زمانے سے لے کر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام تک اس کی یہ مرکزی حیثیت برقرار رہی۔ اور اس نصف صدی کے دوران میں معاشری اصلاح، تعلیمی ترقی اور ملی و سیاسی بیداری کی جتنی تحریکیں رونما ہوئیں ان میں سرسید کا قائم کردہ ادارہ ہمیشہ پیش پیش رہا اور اس نے چند ایسے عظیم رہنما پیدا کیے جنھوں نے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پورے ہندوستان کی قیادت کا فرض انجام دیا۔

سیاسی اعتبار سے سرسید کی تحریک کے نتائج نہایت اہم اور دور رس ثابت ہوئے۔ اس کی بدولت مسلمانوں میں ملی و سیاسی شعور بیدار ہو گیا اور انھوں نے اپنے مستقبل کی تعمیر اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے سیاسی میدان میں بہت اہم اور فیصلہ کن قدم اٹھائے۔ چنانچہ ملی مفاد اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کل ہند مسلم لیگ قائم کی اور حکومت سے اپنے مطالبات منوانے لگے۔ انگریزوں کے زیر سایہ نام نہاد خود مختاری کے بجائے مکمل آزادی کو ہندوستان کا نصب العین قرار دیا اور اس کامیابی کے ساتھ پورے ملک کی قیادت کی کہ یہ تحریک ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی یہاں تک کہ انڈین نیشنل کانگریس اور ہندو رہنما بھی اس کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ پیش کر کے پورے ہندوستان پر فرقہ پرست ہندو اکثریت کی دائمی حکومت کا منصوبہ ناکام بنا دیا اور مسلمانوں کے لیے جداگانہ قومی مملکت کے قیام کی تحریک اس قدر جوش و خروش، عزم و استقلال اور نظم و ضبط کے ساتھ چلائی کہ انگریزوں اور ہندوؤں کی شدید مخالفت اور مقاومت کے باوجود پاکستان قائم کر لیا۔

اس تحریک کو پھیلانے اور کامیاب بنانے کے لیے سرسید اور ان کے ہم سن اور نوعمر رفیقوں نے بڑی جدوجہد کی۔ ان لوگوں میں سید مہدی علی

محسن الملک، مشتاق حسین، وقار الملک، خواجہ الطاف حسین حالی، نذیر احمد چراغ علی، سید حسین بلگرامی، نواب محمد اسحاق، برکت علی، نواب سلیم اللہ، سید محمود، شبلی نعمانی، عزیز مرزا اور شاہدین ہمایوں بہت ممتاز تھے جن کے عزم و عمل نے تحریک کی جڑیں مضبوط کر دیں اور سرسید کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ سرسید کے مقاصد کے حصول اور ان کی تحریک کے فروغ میں علی گڈھ کے طلبا نے خاص طور پر بہت نمایاں حصہ لیا اور اس جدوجہد کو روز افزوں ترقی کے ساتھ جاری رکھا۔ درحقیقت ان طلبا ہی سے سرسید کی امیدیں وابستہ تھیں اور یہی ان کے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتے تھے۔ علی گڈھ کے طلبا نے بہت جلد زندگی کے مختلف شعبوں میں نام پیدا کر لیا اور نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ پورے ہندوستان میں انھوں نے عزت و شہرت اور نمایاں معاشری مرتبہ حاصل کیا۔ ان طلبا میں محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، ضیاء الدین اور آفتاب احمد خاں جیسے نامور سیاسی رہنما، ادیب و شاعر، صحافی، خطیب اور ماہر تعلیم پیدا ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ سرسید کے اسی ادارہ نے آزادیِ کامل، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں کے بانی و قائد پیدا کیے۔ اور یہیں سے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو بھی کئی ممتاز رہنما اور ہزاروں مخلص کارکن ملے۔ چنانچہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے قائدین میں سے لیاقت علی خاں، نواب اسماعیل خاں، چودھری خلیق الزماں، خواجہ ناظم الدین، اورنگ زیب خاں، عبد الرب نشتر، عبد القیوم خاں، سکندر حیات، غلام بھیک نیرنگ، قاضی عیسیٰ، بندے علی تالپور، اور افتخار حسین ممدوٹ اسی ادارہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس ملک کی حکومت اور اس کی ترقی و استحکام کی جدوجہد میں بھی ان لوگوں کی خدمات بہت نمایاں ہیں جو علی گڈھ کے فیض یافتہ اور قائداعظم کے رفیق و معاون تھے۔ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کی وفات اور ۱۹۵۸ء میں سیاسی انتشار

کے باعث جب ملک و ملت کو نازک ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا تو علی گڑھ ہی کے دو نامور فرزند لیاقت علی خاں اور محمد ایوب خاں پاکستان کے معمار و محافظ ثابت ہوئے اور ملک کو تباہ کن خطرات سے نجات دلا کر ترقی و استحکام کی راہ ہموار کر دی۔

یہ تحریک سرسید کے رفیقوں اور علی گڑھ کے طلبا تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان کے وہ تمام مسلمان رہنما جو سیاسی فہم و بصیرت رکھتے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے خواہاں تھے، سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر ہوئے اور اس کی مکمل تائید کی۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے تین عظیم ترین رہنماؤں علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح اور قائد ملت بہادر یار جنگ کو سرسید کی تحریک اور مسلم یونیورسٹی سے نہایت گہرا اور قلبی تعلق تھا اور ملت کے درخشاں مستقبل کی تعمیر میں اس ادارہ کی اہمیت سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ سرسید کے ملی مقاصد کی تائید کرنے والے ان رہنماؤں میں آغا خاں، راجہ علی محمد خاں، لالہ ہرسیف الدین، مولانا عبدالباری، محمد سلیمان پھلواروی، نواب مزمل اللہ خاں، سید علی امام، سر عبدالرحیم، شیخ عبدالقادر، سر شاہ سلیمان، فضل الحق، عبداللہ ہارون، ملک برکت علی، محمد اسماعیل، راجہ صاحب محمود آباد، جمال میاں فرنگی محلی، شہید سہروردی، ممتاز دولتانہ، غضنفر علی، فاطمہ جناح اور جہاں آرا شاہنواز بھی شامل ہیں جنکی ملی خدمات سے اس تحریک کی ترقی و کامیابی میں بڑی مدد ملی۔

مسلمانوں کے لیے سرسید کی اصلاحی تحریک کس قدر ضروری اور مفید تھی اور انھوں نے ایک زوال پذیر معاشرہ کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کا مشکل کام کس خوبی سے انجام دیا اس کا صحیح اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ ایک ایسی قوم جو معاشری، سیاسی، اقتصادی ہر اعتبار سے تباہ ہو گئی تھی۔ جو ایک بہت بڑے ملک پر صدیوں حکومت کرنے کے بعد غلام بنا لی گئی تھی اور حکمرانوں کے بغض و عناد کا شکار تھی۔ جس

کی اقتصادی زبوں حالی اور افلاس میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں نہایت پست حالت میں تھی۔ جس کے رسوم و رواج، اخلاق و کردار اور عادات و اطوار بگڑ چکے تھے اور جس کی دینی زندگی میں بے شمار خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ جو نیک و بد میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو کر جہالت کی تاریکی اور گمراہ کن تعلیم کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی، اس کی حالت کو درست کرنا کس قدر مشکل تھا۔ لیکن سر سید نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا اور جس ایمان و ایقان، خلوص و صداقت، عزم و ہمت، فہم و فراست، مستقل مزاجی اور کامیابی کے ساتھ انھوں نے یہ زبردست کام انجام دیا وہ ان کے افکار و نظریات میں چند نقائص کے باوجود ان کی عظمت کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے۔

ذخیرہ محمد و اقبال مجددی لاہور

کتبِ حوالہ

مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا ہے:

(الف)

سرسید کی تصانیف

ابطالِ غلامی ۱۳۱۰ھ

احکامِ طعام اہلِ کتاب۔ ۱۲۸۵ھ

اسبابِ بغاوتِ ہندوستان۔ ۱۲۷۵ھ

الخطبات الاحمدیہ فی العرب وسیرۃ المحمدیہ۔ ۱۲۸۵ھ (مطبوعہ ۱۹۰۳ء)

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل۔ ۱۲۷۸ھ

راہِ سنت در ردِّ بدعت۔ ۱۲۶۷ھ

کلمۃ الحق۔ ۱۲۶۶ھ

نبیقہ در بیان مسئلہ تصویر شیخ۔ ۱۲۶۹ھ

خیر خواہانِ مسلمانان، رسالہ۔ ۱۲۷۷ھ

تصانیف احمدیہ ۱۳۰۰ھ

مسافرانِ لندن۔ ۱۲۸۷ھ

تہذیب الاخلاق، مجلہ۔ ۱۲۸۷ تا ۱۳۱۴ھ

روئداد اجلاس کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان۔ ۱۲ مئی ۱۸۸۲ء

(ب)

مضامین، مکاتیب اور تقاریر کے مجموعے

سرسید کے مضامین تہذیب الاخلاق — ملک فضل الدین

سرسید کے آخری مضامین	امام الدین گجراتی و احمد بابا مخدومی
مقالاتِ سرسید	عبداللہ خاں خویشگی
مقالاتِ سرسید حصہ پنجم	محمد اسماعیل پانی پتی
خطوطِ سرسید	سید راس مسعود
مکتوباتِ سرسید	محمد اسماعیل پانی پتی
سید احمد خاں کے لکچرز و اسپیچز	امام الدین گجراتی
مجموعہ لکچر ہائے آنریبل ڈاکٹر سید احمد خاں	منشی سراج الدین
سید احمد خاں کا سفرنامۂ پنجاب	سید اقبال علی

(ج)

حیاتِ جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی